ویران بہاریں
(افسانے)

ستیش بترا

سن اشاعت :- جنوری ۱۹۶۰ء

ناشر :- ایس بترا

مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

قیمت :- تین روپے

باہتمام :- پنچ پبلشرز، بیسٹری منزل
امین آباد، لکھنؤ

۵	ویران بہاریں
۲۵	فنکار
۳۷	آوارہ
۵۳	بُہرا مستری
۶۹	جھاگ
۹۹	پُل کے نیچے
۱۱۳	روشنی
۱۲۱	بھنور
۱۳۵	کٹی پتنگ
۱۴۳	فاختہ اور ڈیکوٹا
۱۵۹	نحوست
۱۷۱	گیڑے

اپنے افسانہ نگار دوست رام لعل کے نام

ویران بہاریں

اُن معصوم شرنارتھی بچوں کے نام جو
اُجڑنے پر کسی گھر کی زینت نہ بن سکے

"میرا جی چاہتا ہے کہ ہم ایک بار الہ آباد ہو آئیں۔ شاید ہمارا کرن مل جائے؟"
لاجونتی نے ارمان بھری نگاہوں سے بنتا سنگھ کی طرف دیکھا جو پگڑی کا ایک پلّہ منہ میں ڈالے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پر پگڑی باندھ رہا تھا۔ بنتا سنگھ نے پلّہ منہ سے نکال کر مڑ کر لاجونتی کی طرف دیکھا۔ لاجونتی کے چہرے کی افسردگی اور بیچارگی کو دیکھا اور پھر نہایت پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"لاجونتے دو سال ہو گئے ہیں متواتر اسی طرح گھومتے۔ جگہ جگہ کی خاک چھانتے۔ اب بیچارے کرن کا کیا پتہ لگ سکتا ہے۔ واہگورو کرے وہ زندہ ہو"

بنتا سنگھ پھر پگڑی باندھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ماں کی ممتا لاجونتی کے اندر اتنا عرصہ گذر جانے پر بھی سُلگ رہی تھی۔ کانگڑے کی لاٹوں والی دیوی شاید سرد پڑ جائے لیکن لاجونتی کی ممتا کبھی ٹھنڈی نہ ہو گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لاجونتی کی کوکھ اب اسکے لیے اور کوئی بچہ پیدا نہ کر سکتی تھی اور شاید اسی احساس نے لاجونتی کی ممتا کو ایک غیر معمولی تقویت دے دی تھی۔

"آپ نے نہیں سُنا۔ وہ جو ہمارے محلّے میں بھاگ دیوی تھی نا اُسے اپنی لڑکی کوراں وہیں الہ آباد کے اناتھ آشرم میں ملی ہے وہاں چند شرنارتھی بچے ہیں۔ ممکن ہو ہمارا کرن بھی وہیں ہو!" اور لاجونتی نے پھر اپنی اُداس آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف

جھانکا۔ بنتا سنگھ کو اِن بھی بجھی آنکھوں میں اُمید کی ایک خفیف سی لہر تڑپتی نظر آئی اور پھر جیسے اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا ہو۔

"کچھ فائدہ نہ ہوگا لاجونتی۔ اس سے پہلے بھی تو ہم اس ٹمٹماتی اُمید کے سہارے امرتسر اور امرتسر کے بعد جالندھر، لدھیانہ، انبالہ، متھرا، دہلی گھوم چکے ہیں۔ ہم نے کس رشتہ دار سے پتہ نہیں چلایا۔ کونسا آشرم، یتیم خانہ نہیں چھانا۔ کونسی جگہ ہم نے چھوڑ دی ہر اخبار میں اشتہار دیا۔ ریڈیو بھی چار مہینے متواتر اس کی گمشدگی کا اعلان کرتا رہا لیکن"

"میرا دل کہتا ہے وہ ہمیں مل جائے گا۔ آپ ایک بار یوں تو چلیں"۔

لاجونتی نے نہایت پُر اُمید نظروں سے بنتا سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسکی آنکھوں کی شدید گہرائیوں میں ایک التجا تھی، ایک پکار تھی جو بنتا سنگھ کو ہر موقعہ پر بے بس کر دیتی۔ اس نے یہی پکار، یہی التجا ہر کسی نئے شہر میں کرن کو ڈھونڈنے کی خواہش پر لاجونتی کی آنکھوں میں دیکھی تھی اور وہ کبھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

"اچھا جیسی تمہاری مرضی لاجونتے"۔

اور اُس نے جلدی سے مُنہ پھیر لیا تاکہ لاجونتی اس کی آنکھوں کی نمی کو نہ دیکھ سکے۔ وہ جانتا تھا کہ کرن کی مزید تلاش بیکار تھی۔ وہ کبھی بھی اس کو ڈھونڈھ نہ پائیں گے۔ اور خصوصاً ہر ایسی تلاش اور جستجو کے بعد کئی دنوں تک مایوسی کی سیاہی لاجونتی کے چہرے پر چھائی رہتی۔ وہ ہر ایسی تلاش کے بعد اور بھی نا اُمید ہو جاتی۔ اُس کو خود اپنی زندگی پر بھروسہ نہ رہتا اور یہ چند دن نہایت ہی مشکل میں کٹتے۔ حتیٰ کہ ایک نئی اُمید لاجونتی میں جنم لیتی اور اُسے پھر تلاش جاری کرنے پر مجبور کر دیتی۔

آج تقریباً دو سال پہلے انہیں اگست ۱۹۴۷ء میں مجبوراً اپنے چھوٹے سے

پُرسکون قصبے جیچو کی ملیاں کو آدھی رات کے وقت چھوڑنا پڑا تھا۔ مسلمان غنڈوں نے ایکا ایک رات کو حملہ کر دیا اور بنتا سنگھ کو اپنی بیوی اور بچّہ کی جان بچانے کے لیے اپنے گاؤں کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ان غنڈوں کا وہیں ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ شامل ہو جاتا لیکن اس کے ساتھ کنبہ ہونے کی وجہ سے گاؤں والوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ کنبہ کو اپنی حفاظت میں لے جائے راستہ میں قلعہ ستار شاہ کے پاس اچانک ایک حملہ ہونے کی وجہ سے کرن اِن سے بچھڑ گیا — اور پھر وہ آج تک نہ مل سکا۔

ہندوستان کی سرحد پار کرنے کے بعد وہ عرصہ تک امرتسر میں کرن کا انتظار کرتے رہے۔ وہ پاکستان سے ہر آنے والے قافلے کا بے چینی سے جائزہ لیتے، ہر آنے والے سے کرن کی خبر پوچھتے لیکن سب بیکار۔ وہ ہر سٹیشن پہ، ہر شہر میں کھوئی ہوئی نظروں سے بدحواس شرنارتھیوں کو دیکھتے رہے۔ ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کرن کی تلاش میں اُدھر اُدھر بھٹکتی رہتیں۔ ان کے کان اس کے انتظار میں ریڈیو کے ساتھ لگے رہتے لیکن دُنیا بھر کی خبریں دینے والا ریڈیو ان کے کرن کی کوئی خبر نہ دیتا۔ ہر گاڑی، موٹر، ٹرک کی آمد کے ساتھ اُن کی نگاہیں آگے بڑھتیں اور پھر ناکام ٹکرا کر لوٹ آتیں۔ نہ جانے اِن کی طرح کتنوں کے بھائی بہن، ماں۔ باپ بیوی بچے بچھڑ گئے تھے اور نہ جانے کتنی ہی آنکھوں کا پانی ان رشتہ داروں کے انتظار میں سوکھ گیا تھا۔ بے رونق، بے نور پھٹی پھٹی آنکھیں چاروں طرف انسانوں کے بے پناہ طوفان میں اپنے عزیز کو ڈھونڈھتی پھرتی تھیں۔ سٹیشنوں کی دیواریں اوپر سے نیچے تک جہاں بھی کچھ جگہ تھی، ان گنت پیغاموں سے سیاہ ہوئی پڑی تھیں۔

پنسل سے، قلم سے حتیٰ کہ کوئلے کی سیاہی سے کچھ واضح اور کچھ غیر مبہم سے سندیسے سب نگاہوں کے لیے جاذبِ نظر بنے ہوئے تھے: " بھائی کرشن گوپال گلاٹی سیالکوٹ والے میں نے آپ کا جالندھر میں بہت انتظار کیا۔ اگر آپ اس سندیسے کو پڑھ پائیں تو سیدھے دہلی چلے آویں۔ رام لعل یا پھر بزرگوار کیسری مل جی چاولہ ادکاڑے والے۔ میں ہردوار جانکی کے یہاں جا رہا ہوں۔ کنہیا لعل مل گئے ہیں۔ دیوی چند" اور یا پھر "عزیز ترلوکی مل۔ میں کرنال جا رہا ہوں۔ ایشر داس کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں ملا اگر تمہیں معلوم ہو تو فوراً تار دو۔ چیت رام آڑھتی سانگلہ والے" اور پھر ایسے سینکڑوں ہزاروں بے معنی اور پُر معنی پیغام رنج اور تکلیف کی داستانیں جن میں کہیں کہیں کبھی کوئی حوصلہ افزا خبر بھی ہوتی لیکن یہ بہت ہی شاذ و نادر تھا۔ جب کہیں کسی ایک جگہ کے رہنے والے دو آدمی ملتے تو یوں معلوم ہوتا گویا دونوں کو ایک کھوئی ہوئی دُنیا مل گئی ہو، ایک ایسی دُنیا جو اُفق کی تاریکیوں میں گم ہو گئی تھی اور اب ایکا ایک اِن تاریک بادلوں میں سے جھانک پڑی ہو۔ فلاں کا کیا حال ہے! خیریت تو ہے؟ فلاں جگہ کا فلاں تاریخ کو کیا حال تھا۔ کہاں سے کہاں آگ لگی تھی اور پھر کیا ہوا؟ کچھ لائے ہو؟ اور آخری سوال پر آنکھیں چھلک پڑتیں۔ لوگ مال، اسباب، جان، دولت، رشتہ دار، بہو بیٹیوں کی قربانیاں دے کر آ رہے تھے۔ کوئی بھی یہ نہ جانتا کہ اُس کی منزل کدھر ہے، اُسے کہاں جانا ہے، کیا کرنا ہے، اس کے مستقبل کا کیا ہوگا؟ شاید یہ سوال انکے ذہن کی گہرائیوں کی سطح پر اُبھرنے کو ہی ہوتے تو کوئی غیر انسانی احساس انھیں اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ کھانے پر مجبور کر دیتا۔

اور جب بنتا سنگھ اور لاجونتی کی آنکھیں کرن کے انتظار میں تھک کر چور ہو گئیں

تو وہ مایوس ہو کر شرنارتھیوں کے ایک ریلے کے ساتھ آگرہ تک بہہ آئے۔ وہاں بنتا سنگھ نے منڈی میں دال، مرچ وغیرہ کا بیوپار کر لیا۔ چند ہی دنوں میں اس کی محنت سے یہ بیوپار چل نکلا۔ معاشی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے پر بنتا سنگھ اور لاجونتی کا خیال پھر کرن کی طرف دوڑا۔

اسی اثنا میں لاجونتی چپ چاپ کرن کی یاد میں گھلتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا اس نئی زندگی، اس نئے ماحول میں جڑیں پکڑنا ضروری تھا، اسی لیے جب تک بنتا سنگھ کا کام چل نہ نکلا وہ کرن کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائی۔ گو بنتا سنگھ لاجونتی کی چہکتی طبیعت میں ایک خوفناک تبدیلی دیکھ رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا اور پھر کبھی کبھی جب لاجونتی اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکتی تو وہ ان جانے میں بیٹھے بیٹھے کہہ اُٹھتی۔

"میں نے کہا جی۔ اب تو کرن چھ برس کا ہو گیا ہو گا نا۔ اب تو وہ اچھی طرح بول لیتا ہو گا۔ خوب بھاگ دوڑ لیتا ہو گا۔ اگر ہم چیچو کی ملیاں میں ہوتے تو وہ اس وقت تک سکول جانے لگتا۔ کیوں جی؟"

اور کرن کے خیالات کا جھونکا بنتا سنگھ کے ماضی کے سلگتے کوئلوں پر راکھ اُڑاتا ہوا انہیں ایک بار پھر دہکنے پر مجبور کر دیتا۔ جب کرن اڑھائی سال کا ہونے کے باوجود بھی اچھی طرح سے بول نہ سکتا تھا تو اس نے واہگورو کے آگے منت مانی تھی کہ جب کرن بولنے لگے گا تو وہ ڈیرہ بابا نانک جا کر سوا روپے کا پرشاد چڑھائے گا اور گورو گرنتھ صاحب کے لیے ایک نیا سور پھل خرید دے گا اور جب کرن نے پہلی بار اپنی زبان سے "با۔با" کے صاف لفظ نکالے تھے تو اس نے گاؤں بھر میں لڈو اور مکئی بانٹی تھی اور منت کے

مطابق ڈیرہ بابا نانک جاکر تمام چیزیں چڑھائیں۔ بنتا سنگھ کی بڑی خواہش تھی کہ کرن بھی باقی بچوں کی طرح اپنے باپ سے مٹھائی اور کھلونوں کی فرمائش کرے۔ وہ اپنی بیچوکی ملیاں والی دوکان پر روز کرن کے لیے کوئی نہ کوئی چیز خرید کر رکھ لیتا اور جب کرن شام کے وقت بھولتا بھالتا ماں کی انگلی پکڑے دوکان پر آتا تو وہ مسکرا کر الماری کے خانے میں سے تحفہ اٹھا کر کرن کی نذر کرتے ہوئے کہتا۔

"نئے جوان۔ بھڑ یاراں دا حصہ" اور ننھا "جوان" خوشی سے تالیاں بجاتا باپ اور پھر ماں کے ساتھ چمٹ جاتا۔ بنتا سنگھ کا سینہ ایک نامعلوم خوشی سے پھول جاتا اور لاجونتی فخریہ نگاہوں سے بنتا سنگھ کی طرف دیکھنے لگتی۔

اب بھی دو ایک مرتبہ بنتا سنگھ نے دوکان میں بیٹھے ہوئے کسی گزرتے ہوئے مٹھائی والے یا کھلونے والے سے بھولے میں مٹھائی اور کھلونے خرید کر رکھ لیے تھے اور باوجود کام میں مصروف ہونے کے اس کی نگاہیں کرن کے انتظار میں عرصہ تک اٹھی رہیں۔ حتیٰ کہ ایکا ایک کرن کی گمشدگی کے تلخ احساس نے اس کے انتظار کے تانے بانے کو توڑ کر رکھ دیا اور پھر وہ اپنی آنکھوں کی نمی پونچھ کر گاہکوں کو سودا دینے میں مصروف ہو گیا۔

لیکن بنتا سنگھ نے اپنے احساسات کا ایک لفظ بھی لاجونتی سے نہ کہا تھا کیسے ڈر تھا کہ اس کی اپنی کمزوری لاجونتی کے دکھ کو کہیں بے سہارا نہ بنا دے۔ اسی لیے وہ لاجونتی کو سمجھاتا بجھاتا لیکن وہ خود دل میں تڑپتا رہتا۔ لاجونتی کی طرح اسے بھی کرن کی شوخیاں، ضدیں اور معصوم اشارے یاد آتے رہتے۔

اسی لیے جب کبھی لاجونتی کسی جگہ جاکر کرن کو ڈھونڈھنے کا تقاضا کرتی تو وہ

شروع شروع میں تو ایک دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا لیکن اس کے اپنے ہی احساسات جلد ہی اس دیوار کو گرا دیتے اور وہ لاجونتی کو لے جانے کے لیے رضامند ہو جاتا۔

"لاجونتے۔ الہ آباد آ کر بھی ہمارا کرن نہ ملا۔ الہ آباد کا چپہ چپہ چھان مارا، ہر آشرم، یتیم خانہ دیکھ لیا۔ لاجونتے اپنی ضد سے باز آ جاؤ۔ واہگورو نے کرن سے ملوانا ہوا تو وہ آپ ہی آپ ملوا دے گا۔ اب تم کہاں تک ڈھونڈتی جاؤ گی؟" بنتا سنگھ نے پگڑی کے پلو سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوے کہا۔

"بس صرف ایک اور آشرم رہ گیا ہے۔ مجھے وہاں لے چلیئے" لاجونتی نے ملتجیانہ نظروں سے بنتا سنگھ سے کہا۔ "سُنا ہے وہاں بھی چند شرنارتھی بچے ہیں۔ کون جانے ہمارا کرن وہیں ہو"

"کچھ حاصل نہ ہو گا لاجونتے" لیکن بنتا سنگھ کو معلوم تھا کہ لاجونتی اپنی ضد پوری کیے بنا نہ رہے گی۔

"اچھا چلو"

سڑک کے کنارے ایک بلند عمارت کھڑی تھی۔ سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں سے بچوں کے شور وغل کی آواز آ رہی تھی۔ لاجونتی کے دل میں جیسے ایک نئی اُمید کا چراغ جل اُٹھا ہو۔ اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور پھر چلتے چلتے اس کی نظریں باغیچہ میں کھیلتے ہوے لڑکے لڑکیوں کا جائزہ لینے لگیں۔ تمام بچے چار یا پانچ برس سے دس بارہ برس کی عمر تک تھے۔ لڑکے پالا بنائے کبڈی کھیل رہے تھے اور ان کے ارد گرد بہت سے بچوں کا مجمع کھیل کو نہایت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا ان سے کچھ دور چند لڑکیاں جھولا جھول رہی تھیں اور اُس سے پرے چند لڑکیاں

بیٹھی ہوئی کچھ کھیل کھیلنے میں مشغول تھیں۔

لاجونتی برابر ان ہی لڑکوں لڑکیوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر ایکا ایک اُسے محسوس ہوا جیسے بنتا سنگھ اس کا شانہ پکڑ کر کسی چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ اُس کا خیال تھا کہ بنتا سنگھ کرن کی طرف اشارہ کر رہا تھا لیکن جب وہ مڑی تو اُس نے دیکھا کہ وہ اُسے آشرم کے سکریٹری صاحب کے کمرے کی طرف چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ بے دلی سے کمرے کی طرف دہی۔

وہ چق اُٹھا کر کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے میز کرسی پر ایک بزرگوار شخص بیٹھے ہوئے کچھ حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔

"آئیے تشریف رکھیئے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں" سکریٹری صاحب نے ان کو دیکھ کر حساب کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہم نے سُنا ہے کہ آپ کے ہاں چند شرنارتھی بچے آئے ہیں۔ ہمارا لڑکا کرن سنگھ ہم سے پاکستان میں بچھڑ گیا تھا۔ ممکن ہے کہیں وہ آپ کے ہاں ہی ہو۔"

"کیا نام بتایا آپ نے کرن سنگھ؟"

لاجونتی کو ایکا ایک ایسے محسوس ہوا جیسے وہ منزل مقصود پر پہنچ گئی ہو۔ اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

"ہاں ہاں کرن سنگھ۔ آپ کے ہاں ہے کیا؟"

"کرن سنگھ!" اُس نے ایک موٹا سا رجسٹر اُٹھا کر ایک لمبی فہرست پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "کرن سنگھ! مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ہاں اس نام کا کوئی لڑکا نہیں۔"

اور جیسے ایک دم لاجونتی کی آنکھوں کے کنول بجھ گئے ہوں۔ بنتا سنگھ اپنے آپ کو

سبھالتا کرسی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایسا ہی جواب کئی مرتبہ سن چکا تھا۔
"آؤ لاجونتی۔ آؤ چلیں۔ میں نہ کہتا تھا اس تلاش سے کچھ حاصل نہ ہوگا!" بتا سنگھ
نے لاجونتی کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب واہگورو پر بھروسہ رکھو۔"
"مجھے یہاں آکر بہت اُمید بندھ گئی تھی لیکن ......" لاجونتی دروازے کی طرف مڑی
"ٹھہریئے۔" سفید ڈاڑھی والے سکریٹری صاحب نے آہستہ سے اٹھتے ہوئے کہا
"مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو اس قدر مایوسی ہوئی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ جب
بچے آشرم میں لائے گئے تو وہ اپنا نام تک نہ بتا سکتے تھے ممکن ہے آپ کا کرن بھی
ایسے بچوں میں سے ہو اگر کچھ حرج نہ ہو تو آپ سب بچے دیکھ لیجیے گا۔ شاید آپ اپنا
بچہ پہچان لیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ کسی بچے کو ماں باپ کا
سایہ نصیب ہو جائے اور کسی ماں باپ کو ان کا اپنا بچہ مل جائے۔"
لاجونتی کو سکریٹری کی یہ پیار بھری باتیں بہت اچھی لگیں۔ وہ سکریٹری کی سفید
ڈاڑھی اور شفقت بھری آنکھوں کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اس کا اپنا گلا بھر آیا
"شکریہ بے حد شکریہ۔ مہربانی۔" اور وہ نہ جانے کیا کیا کہنا چاہتی تھی۔ سکریٹری
انہیں باہر باغیچہ میں لے آیا جہاں لڑکے لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔ تمام لڑکیاں ایک
دائرہ میں بیٹھی تھیں اور ایک لڑکی ایک ڈوپٹہ میں بل ڈالے اُسے ہاتھ میں لیے دائرہ
کے باہر گھوم رہی تھی اور بول رہی تھی "کوکلا چھپاتی جمعرات آئی ہے!" اچانک اُسنے
دوپٹہ ایک لڑکی کے پیچھے رکھ دیا۔ اب وہ لڑکی فوراً اُس دوپٹہ کو اُٹھا کر باہر
دائرے میں دوڑنے لگی اور اُس کی جگہ پہلی لڑکی بیٹھ گئی۔
لڑکیوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھ کر لاجونتی وہیں کھڑی ہو گئی۔ وہ مسکرا کر

بنتا سنگھ سے بولی "جب میں چھوٹی سی تھی تو مجھے یہ کھیل بہت اچھا لگتا تھا" اور پھر وہ کھیل دیکھنے میں اتنی محو ہو گئی کہ وہ ایک بار چلّا کر بولی۔

"اری اس لڑکی کی باری نہیں۔ یہ تو تمہاری باری ہے" وہ ایک اور لڑکی سے مخاطب ہو کر بولی۔ کھیل ایک لمحہ کے لیے رُک گیا اور تمام لڑکیاں لاجونتی کی طرف اور پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ بنتا سنگھ دیکھ رہا تھا کہ لاجونتی ان چند لمحوں کے لیے کرن کو بالکل بھول گئی تھی لیکن اچانک جیسے اس کا سحر ٹوٹ گیا ہو۔

"آؤ اُدھر لڑکوں میں کرن کو ڈھونڈیں" اور وہ بنتا سنگھ کو کھینچ کر لڑکوں کے گروہ کی طرف لے گئی۔

لیکن اِن کبڈّی کھیلتے ہوئے بچّوں میں اُسے کوئی کرن دکھائی نہ دیا۔ کوئی ایسا بچّہ دکھائی نہ دیا جو ماں کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ جائے وہ چند منٹ تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی اچانک اس کی نگاہیں لڑکوں سے دور ایک بھولی بھالی خوبصورت سی لڑکی پر پڑیں جو ایک چھوٹی سی دیوار پر بیٹھی بالکل غیر دلچسپی کے ساتھ ان کھیلوں کو دیکھ رہی تھی۔ لاجونتی کو اس کے چہرے پر ایک غیر معمولی بھولی سی اُداسی نظر آئی جس نے فوراً اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس لڑکی کے لمبے لمبے بال نہایت خوبصورت تھے۔ لاجونتی کے دِل میں اچانک اِن بالوں میں کنگھی پھیرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اس لڑکی کی طرف آئی۔

"کھوگڈّی۔ تم یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟"

وہ لڑکی حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگی لیکن اس کی آواز میں بالکل کوئی اُتار چڑھاؤ نہ تھا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام گڈی ہے مجھے صرف ماں اس نام سے بلاتی تھی۔"

"میں نے تو تمہیں یونہی گڈی کہہ دیا کیونکہ تم ہو بھی گڑیا"، لاجونتی نے مسکراتے ہوئے
کہا۔ "تو ہاں میں پوچھ رہی تھی تم کیوں نہیں جا کر "کوکلا چھپاتی" کھیلتیں؟"

"مجھے اچھا نہیں لگتا"۔ نہ صرف اُس کی آواز میں کوئی اُتار چڑھاؤ تھا بلکہ اس کے
چہرے کے نقش بھی گویا کسی پتھر پر کھدے ہوئے تھے۔

"وہ دیکھو بچے جھولا جھول رہے ہیں تم کیوں نہیں...."

"مجھے اچھا نہیں لگتا" لاجونتی کو یہ سوکھا سا مختصر جواب سُن کر سخت حیرت ہوئی
وہ نہایت پیار سے بولی۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"گڈی"

"گڈی اور کچھ نہیں!"

"کچھ نہیں"، لاجونتی کو ایکا ایک خیال آیا۔ سکریٹری صاحب ٹھیک کہتے تھے
کہ بعض بچے اپنا نام تک نہ بتلا سکتے تھے لیکن کرن تو اپنا نام لے لیتا تھا چاہے
وہ توتلی زبان میں "کلن" ہی کہتا۔

"گڈی تمہارے بال کتنے اچھے ہیں!" اُس نے پیار سے اُس کے بالوں
میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"سچ میری ماں بھی یہی کہتی تھی؟" بچی کے چہرے پر کوئی حیرت یا خوشی کے
آثار نہ تھے۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟" لاجونتی ایک لمحہ کے لیے بھول گئی کہ وہ ایک

شرنارتھی بچے سے بات چیت کر رہی تھی جسے ماں باپ سے بچھڑے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔

"میری ماں" وہ کچھ عرصہ تک خاموش رہی اور پھر اُس نے اسی لہجہ میں کہا "مجھے معلوم نہیں" لاجونتی کو کچھ ایسے معلوم ہوا جیسے وہ جانتی ہو لیکن سوال کا جواب دینا نامناسب سمجھ رہی ہو۔

"اچھا گڈّی" اور اُس نے الوداع کہنے کے لیے ہاتھ اُٹھا دیا۔ گڈّی نے بھی دیوار پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ ہلا دیا۔ گڈّی کے چہرے پر کسی بھی قسم کے آثار نہ تھے۔ بالکل جیسے لاجونتی ایک پتھر سے باتیں کر کے آئی ہو۔ سوائے اس کے کہ وہ بول سکتی تھی۔ ہاتھ پیر ہلا سکتی تھی۔ اُس میں اور ایک مورتی میں کوئی فرق نہ تھا۔

"عجب لڑکی ہے گڈّی بھی!" وہ واپس بنتا سنگھ اور سکریٹری صاحب کے پاس جا کر بولی۔ بنتا سنگھ ابھی تک کبڈّی کھیلتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو آپ گڈّی کے پاس گئی تھیں!" آشرم کے سکریٹری نے لاجونتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اُسے دیکھ کر مجھے بھی حیرانی ہوتی ہے وہ الگ تھلگ اکیلی ایک عجب سوچ میں ڈوبی رہتی ہے۔ وہ کسی سے بغیر ضرورت کے نہیں بولتی، کسی بھی کھیل میں حصہ نہیں لیتی۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ وہ باقی لڑکیوں کی طرح گھل مل جائے لیکن کامیاب نہیں ہو سکا!"

"لیکن باقی لڑکیاں تو ایسی نہیں۔ پھر گڈّی کو کیا ہو گیا ہے؟" لاجونتی نے حیرانی سے پوچھا۔

"گڈّی بیحد حساس ہے۔ آپ پوچھتی ہیں گڈّی کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک ایسی بچی جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم، بے رحمیاں اور قتل

دیکھے ہوں، جس کی ماں کی بے حرمتی کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا ہو، دہکتے انگاروں میں جلا کر خاک کر دیا گیا ہو، آپ پوچھتے ہیں اسے کیا ہو گیا ہے؛ میں حیران ہوں کہ وہ اب تک پاگل کیوں نہ ہو گئی ۔"

"اوہ واہگورو" لاجونتی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی - اُسے اب معلوم ہوا کہ وہ ماں کے بارے میں بتاتے بتاتے رُک کیوں گئی تھی - اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں -

"گڈی اگر پاگل نہیں ہوئی تو وہ ایک دن ضرور پاگل ہو جائے گی - ایسے بچے اگر اپنے دُکھوں کو بھلا نہ سکے تو وہ اپنے اردگرد ایک بناوٹی خول سا بنا لیتے ہیں - وہ یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے کوئی چیز اِن کے احساسات کو چھو نہیں سکتی - اسی لیے یہ بچے کسی کے ساتھ گھُل مِل نہیں سکتے - انہیں کسی پر اعتبار نہیں - انسان پر، اس کی انسانیت پر کوئی یقین نہیں - کاش کہ میرے پاس اتنا وقت ہوتا کہ میں ہر بچے کی مجروح ذہنیت کو بدل دیتا - اسے انسان اور اس کی انسانیت پر پھر دوبارہ وشواس دلا سکتا - میں پھر بھی کوشش کرتا ہوں لیکن مجھے کم از کم سوا سو بچوں کی دیکھ بھال کرنی ہے ... اور ملک اور قوم کے لوگ اس میں دلچسپی نہیں لیتے ۔"؟

سکریٹری اچانک خاموش ہو گیا - لاجونتی نمی بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی - ایکا ایک اس کے ہونٹوں میں ایک جنبش ہوئی -

"ایسے بچے .... کیا ایسے بچے کبھی ٹھیک ہو سکیں گے ۔"؟

"ہاں ضرور - ان کا یہ خول ٹوٹ سکتا ہے - انہیں انسانیت پر پھر ایک بار وشواش دلایا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے ماں کی ممتا اور گھریلو ماحول کا ہونا

لازمی ہے جو کہ میرے اپنے گھر میں ناممکن ہے۔ میری بیوی کو مرے آج دو سال ہو چکے ہیں" اور پھر جیسے سکریٹری کا گلا بھر آیا۔

ایکا ایک ہمتا سنگھ کے دماغ میں ایک نیا، ایک انوکھا خیال پیدا ہوا اور پیشتر کہ وہ کچھ کہہ سکے، لاجونتی ایک نئے جوش کے ساتھ بول اُٹھی۔

"میں گڈّی کو لے جاؤنگی۔ میں گڈّی کو پالوں گی۔ گڈّی میری بیٹی ہے۔" اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔

"کیوں گڈّی ہمارا گھر پسند آیا؟" لاجونتی نے گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر گڈّی سے پوچھا۔ گڈّی چند لمحوں کے لیے دہلیز پر کھڑی کھلے صحن کی طرف دیکھتی رہی جہاں املی کا درخت لگا ہوا تھا۔ اُس کی نگاہیں دیر تک پھیلے ہوئے پتّوں اور پتلی پتلی شاخوں کے ساتھ چمٹی رہیں لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

لاجونتی حیران تھی کہ تمام سفر میں گڈّی نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا تھا وہ اس کی خاموشی پر سخت پریشان تھی۔ الہ آباد سے آنے پر تو وہ بالکل ہی خاموش ہو گئی تھی۔ وہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی اور آنکھوں میں چمک دیکھنا چاہتی تھی۔ گڈّی کو درخت کی طرف اس طرح خاموش تکتے دیکھ کر لاجونتی نے محسوس کیا گویا وہ کسی بھولے سپنے کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اُس نے گڈّی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر نہایت نرمی سے بولی۔ "کیا تمہارے گھر میں بھی املی کا درخت تھا؟"

گڈّی کے منہ سے ایک بیجان سی ہاں نکلی اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔

"آؤ تمہیں اندر لے چلوں یہ دیکھو یہ کمرہ ہے ہمارے اُٹھنے بیٹھنے کا۔

گڈّی کی نگاہیں کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر پڑیں پھر بڑے بڑے ٹرنکوں پر جن کی ایک قطار دروازے کے قریب ہی لگی ہوئی تھی۔ بیچ میں فرش پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

"ٹھہرو تمہیں ایک چیز دوں" یہ کہہ کر لاجونتی بھاگ کر ایک ٹرنک کی طرف گئی اور اس میں سے ایک گڑیا لے آئی۔

"یہ لو۔ دیکھا یہ گڑیا لٹانے پر سو جاتی ہے اور کھڑا کرنے پر جاگ جاتی ہے" اس نے دو چار مرتبہ گڑیا کو لٹایا اور پھر کھڑا کیا۔ گڈّی بغور دیکھتی رہی لیکن اس کے رد عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

لاجونتی باقی بچوں کی طرح گڈّی کے چہرے پر حیرت اور اشتیاق کا جذبہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے چہرے کے نقوش گویا بالکل منجمد ہو چکے ہوں۔

"لو۔ پکڑ لو یہ گڑیا" اور گڈّی نے چپ چاپ گڑیا پکڑ لی۔

"کہو اچھی ہے نا گڑیا۔ میں پڑوسن کی لڑکی کے لیے بنا رہی تھی۔ اب اسے اور بنا دوں گی۔

"کیوں میری گڑیا! میری یہ گڑیا تو اس گڑیا سے کہیں اچھی ہے" اور اس نے گڈّی کو سینے سے بھینچ لیا۔

یہاں پڑوس میں تمہاری ہی عمر کی ایک لڑکی ہے لتا اس سے کھیلا کرو گی نا؟ بلا دوں اسے! ابھی تو شاید سکول گئی ہوگی۔ اچھا آ لینے دو۔"

وہ چند لمحوں تک گڈّی کی طرف تکتی رہی۔ وہی بے جان سی پتھریلی آنکھیں لیکن وہ کسی چیز کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ لاجونتی نے مڑ کر دیکھا۔

"میں نے اس لڑکے کو دیکھا — ہے! میں نے اس لڑکے کو دیکھا۔ ہے! یہ کرن کی تصویر ہے!" گڈّی اچانک بول اُٹھی۔ اس کی آواز میں ذرّہ بھر بھی اُتار چڑھاؤ نہ تھا۔

"ہاں یہ کرن کی تصویر ہے۔ تم نے کرن کو دیکھا — ہے؟ تم نے کرن کو دیکھا — ہے؟" لاجونتی دیوانہ وار چلاتی ہوئی دوڑ کر گھٹنوں کے سہارے گڈّی کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ اُس نے گڈّی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"ہاں"

"کب؟ کہاں؟" لاجونتی کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ "سنتے ہو جی؟" اُس نے بنتا سنگھ کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "گڈّی نے میرے کرن کو دیکھا — ہے! گڈّی میرے کرن کو جانتی ہے!"

بنتا سنگھ دوسرے کمرے میں سے دوڑا ہوا آیا۔ لاجونتی اُسے دیکھتے ہوئے بولی "گڈّی نے کرن کو دیکھا ہے! اب میرا کرن مجھے مل جائے گا! اب میں کرن کو پالوں گی! اب میری تلاش ختم ہو جائے گی!"

بنتا سنگھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

وہ چند لمحوں تک اس کی منجمد نگاہوں کی طرف دیکھتا رہا اُس نے پیار سے گڈّی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

"کہاں دیکھا ہے بیٹی کرن کو؟"

لاجونتی کی اشتیاق بھری نظریں گڈّی کے ہونٹوں پر جمی تھیں۔

"قلعہ ستار شاہ کے پاس کھیتوں میں!"

" قلعہ ستار شاہ کے پاس کھیتوں میں!" بنتا سنگھ کے ذہن میں دھندلی یادیں اُجاگر ہونے لگیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ان پر حملہ ہوا تھا اور جہاں ان کا کرن ان سے بچھڑ گیا تھا۔

"رات کے وقت سارا گاؤں جل رہا تھا۔ لال لال آگ بھڑک رہی تھی انہوں نے شام کے وقت میرے باپ کو قتل کر دیا تھا اور وہ میری ماں کو پکڑ کر لے گئے" گڈی کی آواز میں کوئی لرزش نہ تھی۔ صرف ماں کا نام لیتے وقت اسکی آنکھوں میں ایک چمک کوند گئی۔

"کنھوں نے؟" لاجونتی نے ایکا ایک پوچھا۔

"وہی لوگ جن کی آنکھیں لال لال تھیں اور جن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، بندوقیں، لمبے لمبے نیزے اور چھُرے تھے۔ رات کے وقت انہوں نے میرے سامنے کپڑے اُتار کر اسے مارا پیٹا اور میری ماں لال لال آگ میں ڈھکیل دی گئی۔ میں یہ سب چھپ کر مکئی کے کھیتوں میں سے دیکھ رہی تھی۔ میری ماں روئی چلائی لیکن وہ جتنا زیادہ روتی وہ اُتنا ہی اُسے زیادہ مارتے۔ جب اُنہوں نے میری ماں کو آگ میں ڈالا تو وہ چیخی۔ اب بھی مجھے کبھی کبھی وہ چیخ سُنائی دیتی ہے جیسے ابھی تک میری ماں آگ کی لپٹوں میں جل رہی ہو۔"

"واہگورو" لاجونتی کے منہ سے اچانک نکل گیا۔ اُس نے گڈی کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"میں ڈر کے مارے کھیتوں میں بھاگ گئی۔ میں مکئی کے سٹّوں کو اِدھر اُدھر کرتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کہ کہیں اُس کی آواز سُن کر کوئی مجھے بھی

پکڑ نہ لے اور پھر میری ماں کی طرح مجھے بھی آگ میں ڈھکیل نہ دے ۔ اچانک میری ٹکر ایک لڑکے سے ہوگئی جو میری طرح ڈر کر اُس کھیت میں گھُسا ہوا تھا میں اچانک گھبرا گئی ۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا ۔ مجھ سے ٹکراتے ہی چلّا اُٹھا " ماں "

" میرا کرن ! میرا بچّہ ! لاجونتی چلّا اُٹھی ۔

" میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری ماں کہاں ہے ۔ وہ سوائے ماں ماں چلّانے کے کچھ نہ بولا ۔ اُس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ زور زور سے سسکیاں لے رہا تھا ۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا ۔ وہ یونہی سسکتا سسکتا مجھ سے لگ کر سو گیا ۔ دُور سارا گاؤں جل رہا تھا ۔ سارا آسمان آگ کی روشنی سے لال ہو رہا تھا ۔ اچانک پاس والے ایک اور گاؤں سے گولیاں چلنے کی آواز آئی سویا ہوا کرن جاگ اُٹھا اور زور زور سے ماں ، ماں چلّانے لگا "

لاجونتی گڈی کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی اور دبی دبی سسکیاں بھر رہی تھی ۔ بنتا سنگھ کی آنکھیں پُر نم ہوگئی تھیں لیکن گڈی متواتر اسی طرح بولے جا رہی تھی ۔

" میں نے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ اور زور سے رونے لگا قریب سے ہی وہ لوگ نعرے لگاتے گزر رہے ۔ میں بالکل سہم گئی اور کرن کو وہاں چھوڑ کر دُور کھیت کے اندر گھس گئی ۔ مجھے کرن کے رونے کی مدھم سی آواز سنائی دیتی رہی اور پھر وہ لوگ چلّانے لگے " مارو کافر بچے کو ۔ مارو ۔ ایک شور سا ہوا وہ لوگ کھیت کے اندر گھس گئے ۔ سٹوں کی ٹوٹنے کی آوازیں اور کرن کے پہلے سے بھی زیادہ رونے کی آواز میرے کان میں آتی رہی ۔ وہ لوگ کرن کو پکڑ کر لے گئے "

گڈّی کا سانس تیز ہو گیا۔

وہ کرن کو پکڑ کر لے گئے! وہ کرن کو پکڑ کر لے گئے!" لاجونتی سسکیاں۔ لیتے لیتے رو پڑی۔

"مجھے اس کے رونے کی آواز دیر تک آتی رہی اور پھر اچانک ایک لمبی سی چیخ سُنائی دی۔ میں ڈر کے مارے اپنی جگہ سے اُٹھ تک نہ سکی۔ انہوں نے کرن کو مار دیا تھا!" اور گڈّی کی آنکھوں سے ایکا ایک بے اختیار آنسو اُمڈ پڑے۔

"ہائے میرا کرن!" لاجونتی چھاتی پیٹ کر رہ گئی۔ بنتا سنگھ کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر اُس کی ڈاڑھی میں جذب ہو گئے۔ پھر اُس نے جلدی سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ گڈّی کو اس طرح اچانک بے اختیار روتے دیکھ کر اسے ایسے محسوس ہوا جیسے گڈّی کا اپنا تیار کیا ہوا خول ٹوٹ گیا ہو۔

"لاجونتے کرن مر گیا۔ کرن مر گیا" اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "تمہاری تلاش ختم ہو گئی۔ مت روؤ۔ واہگورو نے کرن کی جگہ گڈّی کو بھیج دیا جس کی گود میں کرن نے آخری رات بتائی۔ لو اسے سنبھالو!"

لاجونتی نے ہچکیاں لیتے ہوئے گڈّی کو اپنی گود میں بھینچ لیا۔ گڈّی نے لاجونتی کی طرف دیکھا اور پھر ماں کہہ کر اُس کی گود میں سسکیاں لینے لگی۔

فنکار

راشی اونچے درخت کی ٹہنی پر بیٹھی قافلے میں آئے ہوئے نئے جوڑے کا رقص نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کے چاروں طرف قافلے کے خانہ بدوش ایک تنگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ عورت نے سبز رنگ کی چولی اور زرد رنگ کا لہنگا جو اُس کی کمر میں پیوست ہو گیا تھا پہن رکھا تھا۔ مرد نے سر پر خاص خانہ بدوشی انداز میں ایک رنگدار رومال باندھ رکھا تھا۔ اُس نے چوڑے پائنچوں والی شلوار اور کتھئی رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں تانبے کی پتریوں والی دفیں تھیں جو ہر حرکت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جھنجھناتیں۔ اور اُن کی نقرئی آواز ریگستان کے ٹیلوں سے ہم آغوش ہو کر گونج اُٹھتی۔

ذرا ہٹ کر کھجوروں کے سایہ تلے خانہ بدوشوں کے خیمے نظر آ رہے تھے شام کی ارغوانی روشنی میں کھجوروں کے لمبے لمبے سایے خانہ بدوشوں کے پڑاؤ کو محیط کیے ہوئے تھے اور ابابیلوں کے غول ہلکے نیلے آسمان پر اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہے تھے۔

راشی کی نگاہیں کبھی مرد سے عورت اور کبھی عورت سے مرد کی جانب اُٹھتیں وہ اُنکی ہر حرکت کا بغور جائزہ لینے لگی۔ مرد کی ہر حرکت جاذب نظر تھی۔ اُسکی روح

اُس کا سارا وجود ناچ کا جُز معلوم ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے عورت کی حرکتیں مصنوعی اور کسی قدر بے جان ہوتیں۔ عورت کے ناچ میں جان نہیں تھی جو اس قسم کے ناچ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ راشی سوچنے لگی اگر وہ اس عورت کی جگہ ہوتی تو یہ ناچ مکمل ہو جاتا۔ ہر نقص سے مبّرا۔ راشی کو خود ناچنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن سارے قافلے میں کوئی اچھا ناچنے والا نہ تھا۔ لیکن اب.... راشی کا دل اس نئے خیال سے تھرا اُٹھا۔ اُس کے جسم نے جھرجھری لی اور نرم خنکیاں نہایت تیزی سے اُس کے جسم میں دوڑنے لگیں۔ فضا دفوں کی جھنکار سے مرتعش ہو اُٹھی۔ راشی کود کر درخت سے نیچے آ گئی اور پیڑ کا سہارا لیے نہایت غور سے رقص کرتے ہوئے مرد کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کے پاؤں لاشعوری طور پر دفوں کی تھاپ پر رقص کرنے لگے اور اُس کے ساتھ ہی اُسکی روح ناچنے لگی خانہ بدوش جوڑے نے اپنے جسم کے تمام امکانی خموں کو ایک نہایت تیز چکر میں سمو کر دف پر آخری تھاپ دی۔ دف کے بندھے ہوئے گھنگھروؤں سے فضا گونج اُٹھی۔ چاروں طرف سے واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔

"لارو"! راشی اپنی جگہ سے بچوں کی طرح تالیاں بجاتی مرد کی طرف لپکی "لارو تم کتنا اچھا ناچتے ہو"! وہ اُس کے عین قریب آ کر رُک گئی۔ اُس نے لارو کے مضبوط ہاتھ اپنے نرم نرم ہاتھوں میں لے لیے اور اُنہیں جھلاتے ہوئے کہا "تم واقعی بہت اچھا ناچتے ہو"!۔ لارو اچانک اس طرح پکڑے جانے کی وجہ سے گھبرا گیا۔

یکدم لارو نے مڑ کر دیکھا۔ پاس ہی ایک چیچک کے داغوں والا بدشکل شخص انہیں

گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کے زرد دانت اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں میں سے جھانک رہے تھے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی بھوری تپلیاں اُن دونوں پر گڑی تھیں۔

"ساجا!" راشی زور سے چلائی۔ اُس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی۔ اُس نے غصّہ بھری نظروں سے ساجا کی طرف دیکھا اور لارو کا ہاتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ ساجا آہستہ سے مسکرایا۔ اُس کے گال عجب طرح سے اوپر کو چڑھ گئے اور اُس کا جبڑا نہایت بھدے طریقے سے نیچے لٹک گیا۔ اُس نے دھیرے سے پیٹھ موڑلی اور لنگڑاتا چلدیا۔ لارو چند لمحوں کے لیے ساجا کی طرف دیکھتا رہا۔

"لارو" ! کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تم بہت اچھا ناچتے ہو" ! قبیلہ کا بڈھا سردار اُس کی پیٹھ تھپتھپا کے کہہ رہا تھا۔ لارو گھبراہٹ میں صرف مسکرا دیا۔ ایکاایک تماشائیوں کی بھیڑ کھجوروں کے جھنڈ کی طرف دوڑ پڑی "ادھر آؤ۔ تم نے راشی اور اُس کے شوہر ساجا کا کمال نہیں دیکھا ! یہ کمال تم نے زندگی بھر نہیں دیکھا ہوگا !" قبیلہ کے سردار نے اُسے ایک ہاتھ سے پکڑتے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی لمبی لمبی سفید مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

کھجور کے لمبے درخت کے سہارے ایک بڑا سا تختہ ٹکا تھا۔ تختے کے سامنے بڑی بڑی آنکھوں والی راشی کھڑی تھی۔ اُس کے سانولے جسم پر سورج کی سینددھوری کرنیں نہایت پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ لارو کی نظریں راشی کے جسم پر پھسلتی گئیں۔ راشی کے سیاہ بالوں میں کیکر کے سفید پھول ٹنگے تھے۔ جنہیں وہ پہلی بار اُس کے چہرے کی دلکشی میں دیکھنا بھول گیا تھا۔ اُس کے گلے میں

سمندری گھونگھوں کی مالا تھی اور کلائیوں میں رنگ برنگے کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ جونہی راشی نے لارو کی طرف دیکھا ایک ہلکا سا تبسم اُس کے ہونٹوں پر پیدا ہوا۔ کوئی پچاس فٹ پرے چیچک کے داغوں سے بھرا بدشکل ساجا کھڑا تھا۔ اُس کی سُرخ واسکٹ کے گرد ایک بڑی سی پیٹی تھی جس میں کئی خنجر لٹک رہے تھے۔ خانہ بدوشوں کی بھیڑ اُن کے ارد گرد پھیل گئی۔ ساجا نے کمربند میں سے خنجر نکالا اور نہایت خود اعتمادی سے ہاتھ تول کر پوری قوت سے راشی کی طرف پھینکا۔ لارو کے دماغ کو ایک دھچکا سا لگا اُس کے منھ سے ایک چیخ بلند ہوئی۔..................اُس نے جلدی سے راشی کی طرف دیکھا۔ وہ کھکھلا کر ہنس رہی تھی۔ خنجر ابھی تک اُس کے سر کے اوپر تختے میں پیوست لرز رہا تھا۔ ساجا نے پھر خنجر پھینکا۔ ایک...... چیخ پھر بلند ہوئی اور راشی کے جسم کے پیچ و خم، اُس کی بھری بھری گولائیاں اُس لکڑی کے تختے پر کھنچتی چلی گئیں۔ آخری خنجر پر راشی تختے کے لرزتے خنجروں سے ہٹ کر خرامِ ادا کے ساتھ آگے بڑھ آئی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ تختے میں عین مین اُس کا جسم ڈھل گیا تھا لارو تختے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اُسے راشی کے حسن کا اندازہ اب ہوا اُس کے جسم کی ہر گولائی دلکش اور مکمل تھی۔

آہستہ آہستہ بھیڑ منتشر ہو گئی۔ ساجا لنگڑاتا ہوا خنجر اُتارنے کے لیے تختے کی طرف بڑھا۔

لارو وہیں کھڑا راشی کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"یوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا دیکھ رہے ہو!" راشی نے قریب آ کر پوچھا۔

"راشی تمہیں اس طرح کھڑے ہونے میں ڈر نہیں معلوم ہوتا"؟

"ڈر!" راشی قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ "تم بھول گئے ہو۔ خانہ بدوش ڈرنا نہیں جانتے۔" اُس نے سر پر غرور کو جنبش دے کر کہا۔ اور پھر یکدم جیسے اُسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔

"لارو! وہ لڑکی تسلیم کچھ زیادہ اچھا نہیں ناچتی!"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن دوسرا ساتھی بھی تو نہیں۔"

"ہوں، تو کل میں تمہارے ساتھ ناچوں گی۔"

"ضرور۔ کل صبح ہی۔" لارو یہ کہہ کر مسکرا دیا۔ اُس کا گندمی گول چہرہ کھل اُٹھا راشی دوسرے دن کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ لارو نے ساجا کی طرف جو ابھی تک خنجر اکٹھے کر رہا تھا دیکھا۔ لارو سے نظریں چار ہوتے ہی ساجا نے منہ پھیر لیا۔

"ساجا، واقعی کمال کرتے ہو تم۔ میں نے اس سے بہتر کرتب کبھی نہیں دیکھا۔" جب ساجا پاس سے گذرا تو لارو نے اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ساجا نے ایک قہر آلود نظر لارو پر ڈالی اور بغیر مڑے آہستہ آہستہ لنگڑاتا چل دیا۔

اگلے دن صبح تمام خانہ بدوش راشی اور لارو کا ناچ دیکھنے جمع ہو گئے۔ راشی نے گلابی رنگ کی چولی کے ساتھ سرمئی رنگ کا لہنگا پہن رکھا تھا۔ وہ لارو کے ہمراہ ایک ماہر رقاصہ کی طرح نخلستان کے ریت ملے میدان میں بڑھی۔ ناچ شروع ہوا دفیں زور زور سے بجنے لگیں اُن کے قدم زمین پر تھرکنے لگے۔ اُن کے بازیوں کی آواز فضا میں گونج اُٹھی۔

دونوں جوش و خروش سے ناچنے لگے۔ لارو کے چوڑے پائنچوں والی شلوار

اُبھرتی اور بل کھاتی۔ راشی کے لہنگے کا محیط موسیقی کی تیزی کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور تنگ ہو جاتا۔ اُن کے ناچ میں ربط، ہم آہنگی اور تسلسل تھا۔ گویا وہ ایک عرصہ سے اکٹھا ہی ناچ رہے ہوں۔ راشی کی ہر حرکت پرستانی تھی۔ اُس کا لچکدار بل کھاتا جسم، اُس کے مٹکتے کولھے، اُس کی خم کھاتی صراحی دار گردن اُسکی مخروطی انگلیوں کی جنبش، اُس کی ہوا میں لہراتے ہوئے بازو ناظرین کے دل و دماغ پر چھا گئے موسیقی کی تیزلے کے ساتھ ساتھ وہ جلد جلد چکر کھانے لگے۔ اور پھر یکایک وہ ایک پاؤں گھٹنوں تک اُٹھا کر اور دوسرے ہاتھ سے دف کو ہوا میں لہرا کے رُک گئے راشی کا لہنگا شکنوں میں گھر کر اپنی تیز گردش سے رُک گیا۔ فضا تانبے کی پتریوں اور گھنگھروؤں سے جھنجھنا اُٹھی۔

”راشی اور لارو نے تو کمال کر دیا“ یکدم مجمع نے آگے بڑھ کر راشی اور لارو کو ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔

”راشی اور لارو کا ناچ ہمارے سب قبیلوں سے بہترین ہے۔ ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا“ قبیلے کے بڈھے سردار نے اُن دونوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا: ”مجھے معلوم نہ تھا کہ ہماری ننھی راشی اتنا اچھا ناچ سکتی ہے!“ اُس نے اپنی سفید مونچھوں کو خنجر سے سہلاتے ہوئے کہا۔

راشی کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔

جب سب لوگ خیموں کو چلے گئے تو لارو نے کہا: ”واقعی تم بہت اچھا ناچتی ہو!“ راشی نے اُس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ہلکی ہلکی قوسیں اُبھریں اور وہ مسکرا کر بولی۔ ”سچ“؟ یکایک اُسے پیڑ کے قریب سا جا نظر آیا۔ وہ

اپنے چیچک سے داغوں بھرے چہرے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ گویا وہ اپنے ہر داغ کی گہرائی محسوس کر رہا ہو۔

"ساجا!" لہنگے کے ایک کنارے کو اٹھا کر راشی اس کی طرف لپکی —

"ساجا کہو میرا ناچ پسند آیا؟"

"ہاں" ساجا نے کسی قدر سرد لہجہ میں کہا۔

"تمہارا اور لارو کا ساتھ خوب رہے گا!" وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ساجا کے لہجے میں ایک ہلکا سا طنز اور تلخی بھی پوشیدہ تھی!

تمام دن جھکڑ چلتا رہا۔ ریت کی موٹی موٹی چادریں ریگستانی ہوا کے دوش پر اڑتی رہیں۔ ٹیلے کے ٹیلے پل بھر میں مسمار ہو گئے۔ آن کی آن میں نئے ٹیلے قائم ہو گئے۔ اڑتی ہوئی ریت درختوں سے ٹکرا کر لمبے لمبے سایوں کی شکل میں زمین پر بچھ گئی۔ دن ڈھلے تک ریت کا یہ طوفان بند ہو گیا۔ ابابیلوں کے غول ہوا میں ادھر ادھر چکر لگانے کے لیے نکل پڑے۔ خانہ بدوشوں کے خیموں میں ایک جان سی آ گئی۔ کھلے میدان میں آگ جلائی گئی اور خانہ بدوش عورتیں کھانا پکانے میں مصروف ہو گئیں۔ گاؤں سے مرد بھیک مانگ کر اور کچھ نچا کر لوٹنے لگے۔

فضا میں خنکی تیزی سے پھیلتی گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ کھجور کے لمبے اور نکیلے پتوں میں کانسی کے تھال کی طرح پورا چاند نکل آیا۔ خیموں میں سے کسی نے ایک گیت گانا شروع کیا جس کی لے پر مختلف خیموں میں سے سب نے

گانا شروع کر دیا۔

راشی پانی لینے کے لیے اپنے خیمے سے نکلی۔ اُسے میدان میں کھجور کے درختوں کے پاس چاند کی روشنی میں ایک سیاہ فام شکل نظر آئی۔ اُس نے مٹکی کمر پر رکھ لی۔ وہ چند منٹ تک اُس طرف دیکھتی رہی کوئی شخص کھجور کے درخت کے پاس لکڑی کے تختے پر کوئی چیز گاڑ رہا تھا۔ یہ وہی لکڑی کا تختہ تھا جس پر ساجا اور وہ اپنا کمال دکھلایا کرتے تھے۔ وہ قریب آئی۔ اُس نے چاند کی روشنی میں لارو کو پہچان لیا۔ تختہ پر جگہ جگہ کسی انسانی جسم کی ساخت کے خطوں پر خنجر گڑے تھے لارو خنجروں کی ان لکیروں کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"لارو"! راشی کی آواز نخلستان میں گونجی — گویا کسی نے کانسی کے برتن میں چند سکّے ڈال کر کھنکھنا دیے ہوں — "لارو! یہ کیا کر رہے ہو"؟

لارو نے آہستہ سے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ "راشی تم!" اُس نے سرگوشی میں کہا۔ ایکا ایک اُس نے تختہ پر بنی ہوئی تصویر میں سے ایک خنجر نکال کر دوسری جگہ گاڑ دیا۔ بنی ہوئی تصویر کی کمر کے خم تنگ ہو گئے اُس نے ایک نگاہ راشی پر اور دوسری تختے پر بنی ہوئی تصویر پر ڈالی۔ جیسے وہ ان دونوں کا موازنہ کر رہا ہو۔

"نہیں راشی نہیں!" وہ چلّایا، گویا اُس کی روح کی گہرائیاں شدید درد و کرب سے چلّا اُٹھی ہوں۔ "میں ہرگز تمہارے جسم کو اِس تختے پر نہیں ڈھال سکتا۔ تمہارے جسم کی گولائیاں، تمہارے اعضا کا صحیح تناسب کبھی اِس تختے پر خود بخود نہیں کھنچ سکتا۔ کتنا دلآویز ہے تمہارا جسم! — اِدھر آؤ" اور لارو نے

راشی کو پکڑ کر خنجروں کے درمیان کھڑا کر دیا۔ اور اُس کے جسم کی ساخت پر خنجر گاڑتا گیا۔ حتیٰ کہ راشی کا جسم تختے پر ڈھل گیا۔ راشی تختے کو چھوڑ کر آگے بڑھ آئی۔

"کس قدر مکمل ہیں یہ لکیریں! ہر خم، ہر لکیر، ہر گولائی کسی بھی چیز کی مرہون منت نہیں۔ ہر چیز پایۂ تکمیل کو پہونچ چکی ہے۔ راشی تم خود ایک جیتا جاگتا خواب ہو۔ ایک شاہکار!" اُس نے راشی کو کندھے سے پکڑ کر اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آج کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" راشی نے کہا "مجھے تو ان لکیروں ان خموں میں کچھ بھی نظر نہیں آتا" اُس نے شوخی سے اپنے جسم کو اِدھر اُدھر موڑتے ہوئے کہا۔

"راشی ان لکیروں میں میری کائنات چھپی ہے۔ میرے دل کی ہر دھڑکن ان گولائیوں میں سمو گئی ہے" اور پھر ذرا وہ رُک کے بولا "کتنا بڑا فنکار ہے ساجا جس نے دُنیا کو تمہارے پوشیدہ حُسن سے روشناس کرایا"

"ہوں" راشی یہ کہہ کر گلہری کی سی تیزی کے ساتھ پاس والے کھیجڑی کے درخت پر چڑھ کر ایک موٹی سی شاخ پر لیٹ گئی۔

"کتنا بدشکل ہے ساجا جس نے میری روشن دُنیا کو تاریک بنا دیا!" وہ یہ کہہ کر حقارت بھری ہنسی ہنسنے لگی۔ لارو کی آنکھوں کے سامنے یکایک ساجا کا بدنما سیاہ چہرہ گھوم گیا۔ چیچک کے بڑے بڑے داغوں سے بھرپور اُسے راشی کی زندگی ایک دم کھوکھلی نظر آنے لگی۔ اُس نے لیٹی ہوئی راشی کی طرف

دیکھا۔ کس قدر حسین تھی وہ! اُس کے دماغ میں عجیب عجیب خیالات چکر کھانے لگے۔

"کیا سوچ رہے ہو"؟ راشی نے نہایت نرمی سے پوچھا۔

"اگر کوئی خنجر اپنا نشانہ چوک جائے تو اِس خوبصورت جسم کا کیا ہوگا"؟ یہ سُن کر راشی کھکھلا کر ہنس دی اور بولی۔

"ساجا کا ہاتھ جم چکا ہے"۔

پھر راشی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اُس کے کنول کی پتیوں سی پلکوں نے اُسکی سیاہ آنکھوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ لارو ٹکٹکی باندھے اُس کے نرم و گداز جسم کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ریگستان پر بچھی ہوئی چاندنی کی طرح درخت کی ٹہنی پر سو رہی تھی اُس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ لارو کی آنکھوں کے سامنے اُسکی قوسیں اور گولائیاں ابھرتی جا رہی تھیں۔ اُس کے سینے کا زیر و بم اُس کے دل میں ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے کسی انجانے خیال کے ماتحت راشی کو ٹہنی سے اُٹھا لیا راشی نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ راشی کے جسم کا لمس اُس کے سارے جسم میں پگھلتا جا رہا تھا۔ لارو اُسے اُٹھا کر میدان میں لے آیا جہاں ریت کا سمندر چاند کی روشنی میں لہریں مار رہا تھا۔ راشی نے اپنی آنکھیں کھولدیں۔ وہ پیار بھری نظروں سے لارو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایکا ایک کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز آئی۔ راشی نے یونہی بازوؤں میں لیٹے لیٹے خیموں کی طرف دیکھا اُسے خیموں پر سے کسی کا ٹیڑھا سایہ لنگڑاتا ہوا پیچھے ہٹتا دکھلائی دیا۔ اُسنے آہستہ سے نظریں پھیر لیں اور وہ لارو کے مضبوط بازوؤں میں پہلے کی طرح بے چین و حرکت لیٹی رہی

ایک مرتبہ پھر راشی حسب معمول کھجور کے نیچے تختے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی چاروں طرف آس پاس کے گاؤں سے بہت بڑا ہجوم ساجا اور راشی کے کمال کو دیکھنے آیا تھا۔ راشی ٹکٹکی باندھے ساجا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ساجا خلاف معمول کچھ زیادہ خاموش تھا جیسے کہ وہ کوئی اہم فیصلہ کرنیوالا تھا اُسکے چہرے کے نقوش گہرے ہو گئے تھے اور اُسکی آنکھوں میں ایک شیطانی جھلک تھی جب تمام لوگ خاموش ہو گئے تو اُس نے کمربند میں سے خنجر نکالا۔ اُس نے ایک نظر راشی پر ڈالی۔ راشی کو یوں معلوم ہوا گویا ساجا کی نگاہیں اُس کو چیر کر دوسری طرف نکل جائیں گی یکایک ساجا نے اپنی پوری قوت کے ساتھ خنجر راشی کی طرف پھینکا۔ خنجر ہوا میں لہراتا ہوا اُس کے جسم سے مس ہوتا تختے میں زور سے پیوست ہو گیا۔ ساجا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اُس نے بپھرے ہوئے شیر کی مانند جلدی سے دوسرا خنجر نکالا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ راشی پر نشانہ تاک کر پھینکا۔ لوگوں کے چہروں پر ایک ہلکی سی خوف کی لہر دوڑ گئی اُنہیں ایسا معلوم ہوا گویا ساجا جان بوجھ کر راشی کو اپنے خنجر کا نشانہ بنانا چاہتا ہو۔ لیکن خنجر ہوا کو چیرتا ہوا راشی کی کمر کے قریب گڑ گیا۔ لارو ایک دہشت زدہ بچّے کی طرح ایک قدم پیچھے کی جانب سرک گیا۔ پھر اُس نے جھنجھلا کر پے در پے خنجر بغیر کسی نشانے کے راشی کی طرف پھینکنے شروع کیے۔ لیکن سب خنجر عین راشی کے ارد گرد گڑتے چلے گئے۔ یکایک راشی چلائی۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے! تم اپنے فن کے ہاتھوں مجبور ہو" اور روشی کے قہقہے ریت کے ٹیلوں سے ٹکراتے، ریت کی وسعتوں پر ابھرتے رہے، پھیلتے رہے۔

آوارہ

خزاں چائے کی ٹرے لیے کمرہ میں داخل ہوا۔ اور پلنگوں کے درمیان پڑی ہوئی تپائی پر ٹرے رکھدی، میری آنکھ کھل گئی۔ خزاں نے حسب معمول کھڑکیوں پر لگے ہوئے پردوں کو سرکا دیا، ایک بیمار سی دھوپ کمرے کی تاریکی کو اُجالے میں بدلنے کے لیے بڑھ آئی، ایکدم روشنی ہونے کی وجہ سے میری نیم وا آنکھیں چندھیا گئیں اور میں پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"صاحب چائے رکھ دی ہے" خزاں کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑا "جی —— وہ اخبار والا ریفیوجی لڑکا باہر آیا ہوا ہے"

"اچھا اُسے بولو۔ ابھی آتے ہیں" میں نے چائے بناتے ہوئے کہا۔ خزاں بڑی احتیاط سے کمرہ کا دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

"نینا! اُٹھو" میں نے نینا کو ہلکے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اُس نے آنکھیں کھولتے ہوئے ایک انگڑائی لی۔ اور ساٹن کی نرم رضائی کو اُتارتے ہوئے اُٹھ بیٹھی

"اوہو۔ ساڑھے سات بج گئے! آج بہت دیر ہو گئی!"

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ ابھی آتا ہوں میں نے اُسے چائے کا پیالہ تھماتے ہوئے کہا۔ میں اپنا چائے کا پیالہ اُٹھا کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ دیپک پیار سے میری ٹانگوں میں الجھ گیا" پاپا جی۔ پاپا جی، کل ہمیں ٹیچر نے کہا تھا۔ آج پکنک ہے"

جب دیکھو روز نکنک! پھر مجھے خیال آیا کہ آخر کے۔ جی میں ٹیچر کرائیں بھی تو کیا؟
میں باہر برآمدہ میں نکل گیا۔ اور ڈیپک بھاگ کر نینا کے پاس چلا گیا۔

"تو تم ہو!" میں نے برآمدہ میں ایک چھوٹے سے کم عمر لڑکے کو بیٹھے دیکھ کر کہا۔ اُس کی عمر بمشکل گیارہ بارہ برس کی ہوگی۔ اور وہ نہایت انہماک سے پھولوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی خوشنما رنگ برنگی "تتلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پاس ہی اخباروں کا ایک بنڈل کھلا پڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ادب سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر نہایت معصومانہ انداز سے ہنستے کرتے ہوئے بولا۔

"جی میری ماں آپ کے ہاں آئی تھی۔ بی بی جی نے کہا تھا کہ میں آج صبح آپ سے مل لوں۔ ہم لوگ بہت غریب ہیں۔ آپ مجھ سے اخبار لے لیا کریں"
اُس نے نہایت میٹھے انداز میں التجا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام"؟ میں نے برآمدہ میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

"جی۔ ونود" میں نے ایک نگاہ اُس کے سر سے پاؤں تک دوڑائی۔ اُس نے قمیص اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ قمیص کے اوپر ایک بند گلے کا کوٹ تھا، اُس کے کپڑے عام اخبار بیچنے والے لڑکوں کی نسبت غیر معمولی طور پر اُجلے تھے۔ پاجامہ میں گھٹنوں کے پاس ایک پیوند لگا ہوا تھا لیکن اس خوبی سے کہ عام نظر پہچان نہ سکتی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں اخباروں کا بنڈل تھا۔ جس کے نیچے ایک موٹا صاف سا خاکی کاغذ تھا تاکہ ہاتھوں کے پسینہ سے اخبار خراب نہ ہو جائیں۔

نینا نے رات کو دفتر سے آنے کے بعد مجھے اس لڑکے کی بابت بتایا تھا
ونود کی ماں ہماری کوٹھی کے عین پیچھے والے مکان کے گیراج میں رہتی تھی

اُس نے نینا کو بتایا تھا کہ وہ شرنارتھی تھے۔ اُن کا گزارہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ وہ خود کشیدہ، سلائی کر کے اپنے چھوٹے سے کنبے کے لیے تھوڑی بہت آمدنی پیدا کر لیتی ہے لیکن ونود کی تعلیم کا خرچ اُس کے معمولی ذرائع پر بھاری ثابت ہوتا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ونود کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے خود محنت کرنی پڑتی۔

"تمہارے پتاجی کیا کرتے ہیں؟" میں نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"جی ـــ وہ فسادوں میں قتل ہو گئے تھے!"

"اوہ!" مجھے یہ سُن کر صدمہ ہوا۔ "تمہارا کوئی بڑا بھائی ہے"؟

"جی نہیں"۔ ایک چھوٹا ہے"۔

"پڑھتے ہو؟ کونسی کلاس میں؟"

"پانچویں میں"۔

مجھے یکدم ونود کے کام کرنے کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اب وہ گھر میں روزی کمانے والا مرد تھا۔ میں نے اُس کے نازک کاندھوں کی طرف دیکھا جن پر ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں بلند عزم کی چمک دیکھی جو کہ اِن مصیبتوں پر حاوی ہونے کا چیلنج دے رہی تھیں،

"تم اخباریں بیچ کر کتنا کما لیتے ہو؟"

"جی کبھی پندرہ کبھی بیس روپے۔ میری سکول کی فیس اور کتابوں کاپیوں کا خرچہ نکل جاتا ہے جو بچ جاتا ہے۔ ماں کو گھر کے خرچ کے لیے دے دیتا ہوں۔"

"شاباش بچے!" اور جیسے میرے نزدیک چھوٹے سے لڑکے کی اہمیت

بڑھ گئی ہو۔ کتنا ہمتی لڑکا تھا!

"اچھا ونود۔ تو دیکھو۔ تم ہمیں کل سے اخبار دے دیا کرو۔ صبح ۷ بجے سے پہلے پہلے۔ اخبار وقت پر اور باقاعدہ آنا چاہیئے"۔

"جی بہت اچھا!" اُس کا معصوم چہرہ خوشی سے کھِل اُٹھا "آپ کا بیحد شکریہ" وہ خوشی سے ہاتھ ہلاتا برآمدہ کی سیڑھیوں سے اُترنے کی بجائے پھولوں کی کیاری کے اوپر سے کود گیا۔

مجھے ونود کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ وہ چند گِنے ہوئے لڑکوں میں سے تھا جو اپنی سخت محنت سے اپنی راہ آپ بنانا چاہتے تھے۔ ایسے لڑکے یقیناً کسی روز چوٹی پر پہنچ جائیں گے، عجب بات ہے کہ ہمارا سماج اِن بچوں کو اور اُن کے کمانے کے طریقوں کو ذلیل سمجھتا ہے۔ لوگ یہ نہیں جانتے کہ بلند کیرکٹر کی بنیاد خود اعتمادی اور سخت محنت پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ نینا ریڈیو سُن رہی تھی اُس کی نگاہیں اخبار پر جمی تھیں۔ دیپک ریڈیو کے سنگیت کی دُھن پر ناچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں نے ونود کو کل سے اخبار دے جانے کے لیے کہہ دیا ہے۔

"ونود؟" "کون ونود؟"

"وہی منشر نارتھی لڑکا جسکی ماں کل تمہارے پاس آئی تھی"!

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ بیچارے کی پڑھائی کا خرچہ نکل جایا کریگا۔ اور ہمیں اخبار تو لینا ہی ہے کسی سے۔ میں کل ہی دوسرے اخبار والے کو منع کر دونگی"!

ونود باقاعدگی سے اخبار دے جانے لگا۔ سردی کی ٹھٹھرتی صبحوں میں

وہ روزانہ پابندی کے ساتھ ٹھیک سات بجے آتا۔ میں اُس سے بیحد خوش تھا۔ کسی ضرورتمند کی وقتی امداد کا احساس بہت حد تک اس خوشی کا ذمہ دار تھا۔ میرا دفتر کناٹ پیلیس میں تھا۔ میں نے کچھ دنوں کے بعد ونود کو شام کے وقت ریگل سینما کے پاس اخباریں بیچتے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا اور لپک کر میرے پاس آیا —

"صاحب ایوننگ نیوز"

میں شام کو اخبار پڑھنے کا قائل نہیں ہوں۔ اور خصوصاً وہی اخبار جس کا صبح کا ایڈیشن گھر آتا ہو۔ اس طرح سے خبریں پڑھنے میں کچھ مزا نہیں آتا۔ اور پھر شام کا ایڈیشن تو اگلی صبح کے ایڈیشن کا مزا بھی کرکرا کر دیتا ہے۔ میں نے نہ کر دی۔ وہ پیچھے ہٹنے ہی والا تھا کہ مجھے اچانک خیال آیا۔

"ونود۔ تم صبح کناٹ پیلیس آتے ہو؟"

"جی ہاں۔ ادھر کناٹ پیلیس میں آٹھ دس گاہک ہیں"

"تو ونود۔ تم ہمارے دفتر میں صبح "ٹائمز" دے جایا کرو"۔ میں نے دفتر کا پتہ بتاتے ہوئے کہا: "ہاں کل ہی سے۔ دیکھو بھولنا نہیں"۔

"نہیں صاحب۔ اخبار کل سے ضرور آجایا کرے گا"۔ وہ خوشی سے ہاتھ ہلاتا ہوا سینما میں سے نکلتے ہوئے ہجوم میں گم ہو گیا۔ مجھے اس کی صاف اور گہری آواز مجمع میں دیر تک سُنائی دیتی رہی۔

"ایوننگ نیوز پڑھیے۔ امریکہ کے صدر آئزنہاور کا بیان امریکہ چین کی شرطیں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ایوننگ نیوز پڑھیے ..... ایوننگ نیوز"۔

ونود صبح کو مختلف کوٹھیوں اور مکانوں میں اخباریں دیتا۔ اس کے بعد آٹھ

ساڑھے آٹھ بجے فارغ ہو کر کھانا کھا کر سکول چلا جاتا۔ سکول سے لوٹتے ہی وہ پریس سے ہوتا ہوا اخباریں لے کر کناٹ پلیس پہنچ جاتا۔ اور وہاں چھ سات بجے تک اخباریں بیچتا رہتا۔ وہ عام اخبار بیچنے والے لڑکوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے عام اخبار بیچنے والے لڑکوں کی میلی کچیلی دھوتی یا پاجامے کی بجائے ایک اُجلی خاکی یا نیلی نیکر پہنی ہوتی۔ اُس کی صاف، شوخ اور گہری آواز، اُس کا تربیت یافتہ بولنے کا سلیقہ اُسے بہت جلد گاہک بنا دیتا۔ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے عام اخبار بیچنے والا معلوم نہ ہوتا۔ اُس کے اخبار پیش کرنے کا ڈھنگ، بات چیت کا طور طریقہ لوگوں کو چونکا دیتا۔ اور وہ خواہ مخواہ اُس سے اخبار لینے پر مجبور ہو جاتے۔ اور پھر اکثر لوگ اُس سے یہ سوال ضرور کرتے کہ آخر وہ کیوں اخبار بیچتا تھا۔

"میں سکول میں پڑھتا ہوں۔ میری ماں پڑھائی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اخبار بیچ کر اپنی پڑھائی کے اخراجات پورا کرتا ہوں" اُس کا صاف اور پُرعزم جواب اُس کے گاہکوں پر ایک بہت گہرا اثر چھوڑتا۔ اور وہ اُس کی ہمت کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے اور اُن میں سے چند ایک تو اُس سے مستقل طور پر اخبار لینے لگتے۔

وہ اُن اخبار بیچنے والے لڑکوں میں سے نہ تھا۔ جو کہ جونک کی طرح لوگوں سے چمٹ جاتے اور محض دہراتے رہتے "اخبار لے لیجیے .... اخبار لے لیجیے.... آج ایک اخبار بھی نہیں بکا"، اور آخر کار لوگ تنگ آ کر اُن سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اخبار لے لیتے۔

ٹنو کی شخصیت اُن لڑکوں سے بہت مختلف تھی جنگلی ٹولی کی ٹولی کسی گاہک

ٹوٹ پڑتی، اور جب کوئی اُن میں سے کسی ایک سے اخبار لیتا اور باقی حسد اور جلن کے مارے اُس سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے اور معاملہ مار پٹائی تک آ جاتا۔ ان میں سے بیشتر لڑکے ان پڑھ، چپڑاسی اور بیروں وغیرہ کے تھے۔ جو آپس میں بات بات پر لڑ پڑتے۔ گندی گندی غلیظ گالیاں بکتے اور سرِ راہ طوفانِ بدتمیزی برپا کرتے۔ ان میں سے اکثر اپنی دن بھر کی کمائی کھانے پینے یا پھر سینما کی بھینٹ کر دیتے۔

نینا نے اکثر ایسے ہی لڑکے دیکھے ہوئے تھے اور وہ ڈیپک کی تعلیم و تربیت کے بارے میں بہت سخت تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ڈیپک کا میل جول سوسائٹی کے اونچے طبقے کے لڑکوں سے ہی ہونا چاہیئے تاکہ وہ گندی اور غلیظ عادتوں سے دور رہ سکے۔ ایک دن جب میں دفتر سے گھر لوٹا تو نینا نے شکایت کی۔

"آپ نے تو وہ اخبار بیچنے والے لڑکے — کیا نام ہے اُس کا — ہاں ونود کو سر چڑھا رکھا ہے۔ وہ اب ڈیپک کو اپنے گھر لے جاتا ہے۔ اُسے اپنے یاروں دوستوں سے ملاتا ہے مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔"

میں جواب میں مسکرا دیا۔ "ونود تو اچھا لڑکا ہے۔"

"کل آیا تھا تو ساری قمیص پھٹ رہی تھی۔ گھٹنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ لڑائی کر کے آیا تھا کہیں سے۔"

"تو کیا ہوا۔ اِس عمر میں ایسی لڑائیاں تو کبھی ہونگی ہی۔"

نینا نے میری طرف اس طرح دیکھا۔ گویا اُسے میری باتوں کا یقین نہ ہو۔ وہ چُپ ہو کر رہ گئی۔

کچھ مہینوں بعد ونود دوپہر کو دفتر میں آیا۔ وہ خلافِ معمول حد سے زیادہ

خوش نظر آرہا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی۔ اُس نے جواب میں شوروم کے دیو قد شیشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سائیکل خرید لی ہے۔ آئیے آپ کو دکھاؤں۔ اُس نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ اُسکی خوشی میں چھوت چھات کا اثر تھا، وہ مجھے بھی متاثر کیے بنا نہ رہ سکی۔ میں اُس کے ساتھ باہر چلا آیا۔ سورج کی روشنی میں سائیکل کا نکل شدہ ہینڈل چمک رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی اور اُسے اُسکی محنت پر مبارکباد دی — اور پھر یہ سائیکل اُس کی اپنی کمائی سے خریدی ہوئی ہی تو تھی!

"اب مجھے اخبار پہنچانے میں کافی سہولیت ہوگی اور پھر اب اتنی زیادہ محنت بھی نہ کرنی پڑے گی۔ یہ دیکھا آپ نے میرا کیریر" اُس نے مجھے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "اخباریں پہنچانے کے بعد کیریر اُتار کر گھر چھوڑ سکتا ہوں" میں اُس کے چہرے پر خوشی ناچتی دیکھ سکتا تھا۔ اور پھر اُس نے سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ اُس کی شوخ آواز فضا میں گونج اُٹھی۔ پھر اُس نے گدی کو سہلایا اور ایک نہایت پیارے انداز سے ہاتھ ہلاتا مجھے اپنی خوشی میں شریک و محو کرتا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اُسے اپنی محنت کا پھل پاتے دیکھ کر ایک بے پناہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دن بعد میں نے ونود کو ریگل کے پاس اخباریں بیچتے ہوئے دیکھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا۔ اُس کے گھٹنوں پر چمڑے کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور وہ ٹانگیں ٹھیک کام نہ کرنے کی وجہ سے سڑک کے کنارے چند اخباریں ترتیب سے لگائے ہوئے پاؤں پھیلائے بیٹھا چلا رہا تھا۔ آج کی تازہ خبریں پڑھیئے۔ "ایوننگ نیوز" اُس کی آواز میں زیادہ دلکشی نہ تھی اور نہ ہی وہ خبروں کے عنوان پکار رہا تھا۔

یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ پہلی مرتبہ اخباریں بیچ رہا ہو۔ اُس کے پاس ہی ونود کا
نیا سائیکل کھڑا تھا۔ آس پاس چند دوسرے اخباریں بیچنے والے لڑکے اخباریں
بیچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دفعتہً شو ختم ہونے کی وجہ سے رنگیل نے تماشائیوں
کا ہجوم اُگل دیا، آس پاس کا خاموش ماحول یکایک زندگی کا ثبوت دینے لگا۔
"انارکلی" کے گانے، ایک ایک آنے، "ریتا آئس کریم" اور "چنا جور گرم" کی گئی
ملی جلی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ اخبار بیچنے والے لڑکوں کا گروہ ہجوم پر
ٹوٹ پڑا۔ "کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کا بیان۔ کشمیر ہندوستان سے الگ نہیں
رہ سکتا۔ آج کی تازہ ایوننگ نیوز" اور اخبار بیچنے والے لڑکے بھوکے گدھوں کی
طرح گاہکوں کے گرد منڈلانے لگے۔

پٹری پر بیٹھا ہوا اپاہج لڑکا ہجوم کو دیکھ کر اپنی بے سُری آواز میں چلانے لگا
"آج شام کی تازہ خبریں" وہ بھی سڑک پر دوسرے لڑکوں کی طرح بھاگ کر
پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہ بھی آگے بڑھ کر اپنے اخبار گاہکوں کو پیش کر سکے۔ وہ جوش
میں آکر بھول گیا کہ وہ اپاہج تھا، بے بس تھا۔ وہ اپنی جگہ سے گھسٹتے ہوئے بڑھنے
لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ شدّت کے درد کی تاب نہ لا سکنے کے باعث کراہتا
ہوا بیٹھ گیا۔ اُس کا سانس درہم برہم ہو گیا تھا۔ اور اُس کی آواز درد کے مارے
حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ اُسکی پھٹی ہوئی آنکھیں ہجوم کو گھورتی رہ گئیں۔ وہ
ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا اور پھر ساتھ پڑی ہوئی بیساکھیوں کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا
وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

"ایوننگ نیوز" اُس نے ہمّت سے آواز دی۔ اور پھر اچانک بھیڑ کا ریلا

اُسکی طرف آیا۔ اور اُسنے اپنے آپ کو گرنے سے بڑی مشکل سے بچایا۔ اُس کی اٹھی ہوئی بیساکھی ونود کے سائیکل سے ٹکرائی۔ اور سائیکل گر گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا اخباروں کا بنڈل زمین پر آرہا۔ اُس نے سائیکل کو اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کو بہت مشکل پاکر چھوڑ دیا۔ وہ بکھری ہوئی اخباریں اکٹھی کرنے کیلئے جھکا۔ اتنے میں ونود گاہکوں کو اخباریں بیچ کر لوٹ آیا۔

"کیوں کتنی اخباریں بکیں گیان" وہ بولتا سا گیا۔ گیان کو اخباریں اکٹھی کرتے دیکھ کر وہ معاملہ کی نوعیت فوراً بھانپ گیا۔

"تمہارا سائیکل ؟" گیان نے گرے ہوے سائیکل کی طرف اشارا کرتے ہوے کہا۔

"ارے اس کا فکر نہ کرو۔ میں ابھی اُٹھائے لیتا ہوں" ونود نے لپک کر سائیکل کو اُٹھایا۔ اور پھر اخباریں اکٹھی کرنے میں گیان کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی" ؟

"نہیں ونود،" اُس نے نظریں اُٹھائے بغیر کہا۔ "اخبار تو ایک بھی نہیں بکی!"

"لنگڑا کیا اخباریں بیچے گا۔ اسے تو بھیک مانگنی چاہیئے" قریب کھڑے ہوے ایک اخبار بیچنے والے لڑکے نے طعنہ زنی کی۔

"بھیک!" گیان بپھر کر بولا۔ گویا اُسے برقی رو نے چھو لیا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک غصہ بھری چمک کوند گئی ہو۔ "میں تمہیں اخباریں بیچ کر دکھاؤں گا" وہ جوش سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ونود نے آگے بڑھ کر اُسے سنبھال لیا اُس کی آنکھوں میں گیان کی اس اولوالعزمی کے لیے عقیدت کا اظہار تھا۔

شام ڈھلے کناٹ پلیس کا ایک آدھ چکر لگا چکنے کے بعد میں نے پنچکوئیاں روڈ پر ونود اور گیان کو اکٹھے جاتے دیکھا۔ ونود کے دائیں ہاتھ میں سائیکل تھا اُس کے ساتھ ہی گیان بیساکھیوں کے سہارے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک پیار کا رشتہ بندھ چکا تھا۔

چند دِنوں بعد میں نے کناٹ پلیس میں پھر دیکھا۔ دوپہر کا وقت تھا وہ ایک بڑے سے سٹور کے پاس فٹ پاتھ پر دیوار کا سہارا لیے میٹھی گولیاں بیچ رہا تھا۔ میں سٹور کے اندر سگریٹ کا ڈبہ لینے چلا گیا۔ باہر گیان اپنے بھدے سُر میں آواز لگا رہا تھا۔

"رس بھری میٹھی گولیاں —— ایک آنے کی چار"

میں نے سٹور کے اندر کھڑے ہو کر دیکھا کہ لوگ اُس کے پاس سے گزرتے اور منہ پھیر لیتے۔ شاید اس لیے کہ وہ اپاہج تھا۔ قریب سے دو بچے اپنی ماں کی اُنگلی پکڑے ہوئے گزرے اُن کی نظریں دیر تک گیان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گولیوں کے ڈبے سے چمٹی رہیں۔ اُنہوں نے اپنی ماں سے گولیوں کے لیے تقاضا بھی کیا۔ لیکن اُس عورت نے گیان پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "اچھا بابا اچھا۔ آگے چل کر لے دیتی ہوں۔ اور وہ یہ کہہ کر بچوں کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر انہیں گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ شاید اُسے گیان کے گھٹنوں پر لگے ہوئے چمڑے کی ٹیوں سے نفرت پیدا ہو گئی تھی یا شاید وہ اُن بدصورت بیساکھیوں کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ جو کہ گیان کے قریب دیوار کے سہارے لگی ہوئی تھیں۔

میں نے سٹور سے نکل کر سگرٹوں کے ڈبے کو کھولتے ہوئے گیان سے پوچھا
"تم تو شام کو اخباریں بیچتے تھے نا۔ یہ گولیاں کب سے بیچنی شروع کیں"؟
اُس نے ایک لمحہ میری طرف دیکھا۔ وہ میری اس غیر معمولی دلچسپی پر حیران سا ہو گیا
"آپ ہی بتائیے۔ میں پڑا پڑا بیکار کیا کروں؟ سوچا شاید اسی سے کچھ بکری ہو جائے۔ اخباریں تو کچھ زیادہ بکتی نہیں، جب سے بیماری سے اُٹھا ہوں، مجھ سے دوڑ بھاگ کہاں ہو سکتی ہے!"

"کیوں کیا ہوا تھا!" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"زور سے بخار ہوا۔ دو ہفتے بستر پر پڑا رہا اور پھر یہ ٹانگیں"...... اُس کا گلا رُندھ آیا۔ میرا قیاس درست تھا۔ وہ پولیو (POLIO) کا مریض تھا۔ تیز بخار اُسے یہ لنگڑاتی اور کمزور ٹانگیں بطور یادگار دے گیا تھا۔

"گھر میں اکیلی ماں ہے۔ کسی طرح گذارہ تو کرنا ہے!" وہ کہے جا رہا تھا۔

"اگر تمہاری ٹانگیں ٹھیک ہو جائیں، تو شاید تم اپنی روزی آسانی سے پیدا کر لو!"

"کھا پی کر جو بچتا ہے۔ وہ علاج کے لیے ہی تو اکٹھا کر رہا ہوں!"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا "شاباش۔ میں خوش ہوں کہ تم اپنی محنت سے یہ پیسہ اکٹھا کر رہے ہو۔ ایشور کرے تمہاری ٹانگیں جلد ٹھیک ہو جائیں!" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک دس روپیہ کا نوٹ نکال کر اُس کی گولیوں کے ڈبہ میں ڈال دیا! "یہ لو میری طرف سے اپنے علاج کے لیے کچھ رقم!"

"آپ مجھے بھیک دے رہے ہیں؟ آپ چاہتے ہیں میں محنت نہ کروں!"

اُس نے نوٹ مجھے واپس دیتے ہوئے کہا اور وہ یہ کہہ کر اپنی بیساکھیوں کے سہارے لنگڑاتا ہوا تیزی سے چلدیا گویا کہ میں پلیگ کا جوہا تھا اور وہ مجھ سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔

"گیان"! میں چلّایا۔ لیکن اُس نے مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس لڑکے کی بلند ہمت نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میں دیر تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس لڑکے میں سخت سے سخت مصیبت جھیلنے کا مادہ تھا!

ایک دن میں صبح دفتر میں آکر بیٹھا ہی تھا اور ضروری ڈاک دیکھ رہا تھا کہ دروازے کے قریب ایک جانی پہچانی آواز سُنائی دی۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں" میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ونود کھڑا تھا۔

"چلے آؤ ونود" کہو کیا بات ہے"؟

وہ قریب آکر نہایت عاجزی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہونٹھ کچھ کہنے کے لیئے بیتاب تھے لیکن شاید وہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ وہ کیونکر کہے

"جی — میں — ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے وہ اپاہج ہے۔ اُس کی بیماری سے ٹانگوں کی قوت ضایع ہو چکی ہے"!

"کون۔ گیان"؟

"جی۔ آپ اُسے جانتے ہیں؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں بولو میں نے کئی بار اُسے تمہارے ساتھ دیکھا ہے"!

"وہ بھی اخباریں بیچتا ہے۔ لیکن زیادہ چل پھر نہ سکنے کے باعث وہ زیادہ اخباریں نہیں بیچ پاتا۔ اُس کے گھر میں اور کوئی نہیں آج وہ اور اُسکی

ماں کئی دنوں سے فاقے کر رہے ہیں۔ گیان بہت خوددار لڑکا ہے۔ میں نے اُس سے کہا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ پیسے اُدھار لے لیکن وہ نہیں مانتا۔ میں نے اُس سے کہا ہے کہ وہ چند ایک میرے مستقل گاہک لے لیکن وہ کسی صورت سے نہیں مانتا۔ اس طرح سے وہ بھوکا مر جائیگا!" اُس کا لہجہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔

"میں کل سے آپ کو اخبار دینے نہ آؤنگا۔ آپ اُس سے اخبار لیجئے گا میری التجا ہے — آپ اُس سے کچھ بھی کہہ دیجئے گا۔ میں آپ کو اخبار وقت پر نہیں دیتا۔ ناغے کر جاتا ہوں، آپ سے پیسوں کے بارے میں لڑتا ہوں جھگڑتا ہوں۔ کچھ بھی کہہ دیجئے۔ لیکن آپ اُس سے اخبار ضرور لے لیجئے۔ میں صبح سے اپنے کئی دوسرے گاہکوں کو بھی کہہ آیا ہوں۔ آپ بھی مان لیجئے ہاں کہہ دیجئے" وہ بے تحاشا بولے چلا جا رہا تھا۔ میں اُس کی اس قربانی سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

لیکن تمہیں بھی تو پڑھنا ہے۔ تمہیں بھی تو اپنی پڑھائی کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے!" میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سُنا۔

وہ مُسکرایا!" میرے ہاتھ پاؤں اچھے بھلے ہیں۔ میرے پاس سائیکل ہے میں دور دور جا کر اور جگہ بھی اخبار دے سکتا ہوں اور وہ یہ کہہ کر باہر چلا گیا میں کچھ لمحوں تک عجیب سوچ میں ڈوبا رہا۔ اچانک مجھے ونود کے سائیکل کی شوخ گھنٹی نے چونکا دیا۔ میں شوروم کے دروازے میں سے ونود کو سائیکل پر چڑھے ہوئے خوشی کی ایک عجیب لہر میں ڈوبا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

شام کو میں اپنی بالکونی میں کھڑا تھا کہ اچانک مجھے دیپک کی خوشی سے

لہراتی آواز پیچھے سے سُنائی دی۔ اور پھر سائیکل کی گھنٹی کی شوخ آواز۔ میں نے نیچے دیکھا۔ دیپک ونود کی سائیکل کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اور بازو لہرا لہرا کر مجھے بُلا رہا تھا۔ اتنے میں کمرے سے نینا باہر آئی۔ اُس نے دیپک کو ونود کی سائیکل پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھا آپ نے؟ آپ تو دیپک کو منع ہی نہیں کرتے۔ کِس طرح سے وہ ونود کے ساتھ آوارہ پھرتا رہتا ہے"!

"نینا تمہارے بچے" کو ونود سے اچھا ساتھی نہیں مل سکتا۔ کاش کہ وہ بھی ونود کی طرح آوارہ ہوتا!"

نینا میری طرف گُم سُم نظروں سے دیکھنے لگی۔

بہرا مستری

چمنی کا سیاہ دھواں رفتہ رفتہ دودھیا ہونے لگا۔ یہ دھواں چمنی کے منہ سے نکلنے کے بعد چند ایک مسحور کن چکر کھاتا، کارخانے کی دیوار کے دوسری طرف لگے ہوئے بوڑھے پیپل کے گھنے پتوں میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ پیپل کے درخت کے عین اوپر دُھنی ہوئی روئی کی طرح اس دھوئیں کی خفیف سی لپٹیں نکلتیں جو جلد ہی نیلے آسمان کی وسعتوں میں جذب ہو کر رہ جاتیں اور پھر ایکا ایک نیچے تیزی سے تازہ دم لپٹیں حرکت کرنے لگیں۔ اُنکی جوان آوازیں ٹھک ٹھک کرتیں ایک تسلسل کے ساتھ اس چھوٹے سے پھلوں کے کارخانے میں گونج اُٹھیں جیسے اُنکی رگوں میں جوانی کا گرم گرم خون بہہ رہا ہو۔ ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک، بائلر کی توند میں پانی بھرا چلا جاتا، اور سُر سُر کرتی بھاپ ایک جنونانہ وارفتگی سے بیقرار ہو کر اِدھر اُدھر نکلنے کی کوشش کرتی اور پھر مایوس ہو کر بائلر کی پیشانی پر لگی ہوئی گھڑی کی سوئی کو ایک جنبش دے کر ایک اور نشان اوپر بڑھا دیتی۔

بائلر کی بھٹی کے قریب بہرامستری کوئلہ جمع کر رہا تھا۔ جب وہ کدال سے کوئلہ اُٹھا کر بھٹی کے منہ میں پھینکتا تو لپکتے ہوئے شعلے ایک لہر کی طرح بل کھا کر پہلے سے بھی زیادہ تندی سے کانپنے لگتے۔ کوئلہ اُٹھاتے وقت

اُس کے برہنہ بازوؤں کی سخت مچھلیاں اُبھر کر پھڑ پھڑانے لگتیں اور جب وہ بدن سیدھا کرتا تو اُس کا تندرست گٹھا ہوا جسم پھیل سا جاتا۔ ایکا ایک وہ مڑا اور اُس نے ایک کل مروڑی۔ لپٹیں سرد آہیں بھرتے بھرتے بے ترتیبی سے رُک گئیں۔

"کیوں بے لبھنتو؟ نو بج چکے ہیں۔ ابھی تک سٹیم تیار نہیں ہوئی؟" کارخانہ کی کھڑکی میں سے فورمین کی چنگاڑھتی ہوئی آواز اُسکے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہیں؟" اُس نے جان بوجھ کر اپنے کان اُس کی طرف موڑتے ہوئے استفسارانہ لہجہ میں پوچھا۔

"ہیں کے بچے۔ ابے اسٹیم تیار ہوئی یا نہیں۔ سب کام تمہاری وجہ سے بند پڑا ہے" فورمین نے پہلے سے بھی کڑکتی آواز میں پوچھا۔

"ابھی ہوئی جاتی ہے، لبھنتو نے اپنے سیاہ ہاتھ کپڑے کے ایک بوسیدہ ٹکڑے سے پونچھتے ہوئے کہا۔ "تیل تو اتنی دیر میں ملا۔ آگ دینے سے پہلے صفائی نہ کرو یا تو بائلر خراب ہو جائے یا پھر اس کا کون ذمہ دار ہوگا، وہ بڑبڑائے جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ پونچھ کر کپڑے کو اپنے اوزاروں کے بکس میں لاپرواہی سے پھینک دیا۔ آخر یہ فورمین بابو اُسے سمجھتا کیا تھا؟ وہ جھنجھلا کر بائلر کو تیل بھرے چیتھڑے سے صاف کرنے لگا۔ صرف اسلیئے کہ فورمین کے جال میں نہیں پھنسنا تھا۔ اُسکے خیالات پھر کلبلانے لگے، وہ فورمین کے تمام ہتھکنڈوں کو جانتا تھا۔ اُسکی بیوجہ تلخی کا مطلب بھی وہ سمجھتا تھا۔ اسی لیے نا کہ وہ مہندر بابو کی دُکان جس میں کہ فورمین کا

بھی حصّہ تھا۔ آٹا۔ دال نہیں خریدتا تھا اور اس طرح سے بازار سے دُگنے تگنے دام نہیں دیتا تھا۔ اسکے علاوہ اُس نے اس مہینے تنخواہ کے وقت فورمین کو اس میں سے معمول کا حصّہ دینے میں بھی پس و پیش کی تھی — ہر مزدور کی تنخواہ کا دس فیصدی حصّہ تو فورمین کا حق ہوتا تھا ورنہ اُسے اس فیکٹری میں کام کرنے کا موقعہ ہی کہاں ملتا۔ اس مہنگائی کے زمانے میں سو روپے میں سے دس روپے دینا اپنے جسم میں سے سیر بھر خون دینے کے برابر تھا۔ باقی تنخواہ میں ہوتا ہی کیا تھا ساری کی ساری تنخواہ مہینے کے پہلے آٹھ دس دن میں ہی ختم ہو جاتی اور باقی روز مزدوروں کے لیے سوائے قرض یا پھر سودا اُدھار لینے کے کوئی چارہ نہ تھا اور فورمین کے بھائی کو اُدھار دینے میں کوئی عذر نہ تھا کیونکہ نہ صرف اُس کی رقم محفوظ ہی تھی بلکہ منہ مانگے دام بھی لے سکتا تھا۔ لبنتو نے کارخانے کے باقی مزدوروں کو اُکسانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اسی لیے تو وہ فورمین کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔

ایکا ایک صاف کرتے کرتے اُس کا ہاتھ تپتے ہوئے بائلر کے جسم پر پڑا اُس نے اُف کرتے ہوئے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا اور ساتھ ہی فورمین کو ایک گالی بک دی۔ اچانک اُسے احساس ہوا جیسے کوئی اُس کی طرف دیکھ رہا ہو وہ مڑا۔ سامنے کوئلہ ڈھونے والی عورتیں دھوتی کو اپنی کمر کے گرد مضبوطی سے لپیٹے ہوئے اُس کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ اُسے قریب ہی کوئلہ پھینکتے ہوئی ایک عورت کے ہونٹ ہلتے معلوم دیے۔ یونہی خالی فضا میں لرزتے اور پھر جیسے اُن سب کے منہ سے قہقہوں کا طوفان بہہ نکلا ہو۔ جب وہ ہنستیں تو اُن کے

سینے کے زیر و بم کے ساتھ ان کے ڈھیلے لٹکتے ہوئے ہاتھوں میں ٹوکریاں بھی ہلنے لگتیں۔ اور پھر ایکا ایک وہ بھی مسکرا دیا۔ اسے دیکھ کر وہ اور بھی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ کچھ ملے جلے مبہم اور غیر واضح سے الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے اور پھر وہ عورتیں منہ موڑ کر آہستہ آہستہ کوئلے کے ڈھیر کی طرف اٹھلاتی ہوئی چل پڑیں۔

کاہے ہنس رہی ہو؟" وہ ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولا۔ لیکن وہ عورتیں ذرا دور جا چکی تھیں۔ وہ اُن کے تندرست جفاکش جسموں کی طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے ایک نگاہ بائلر کی گھڑی پر ڈالی اور کارخانے کا سٹیم والو کھولدیا۔

شوں شوں بھاپ شور کرتی کارخانے کی مشینوں میں گونجنے لگی۔ کارخانے کی کھڑکی میں پھر فورمین کا سر نظر آیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ لبنتو نے اسکی طرف دیکھا لیکن وہ اُس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگا رہا۔

اتنے میں اندر سے دلارا نکلا اور لبنتو کے قریب آ کر بلند لہجہ میں کہنے لگا "مستری فورمین صاحب خفا ہو رہے ہیں۔ تم بغیر بتائے ہی اسٹیم کھولدیتے ہو؟"

لبنتو نے اُسکے قریب آ کر "ایہہ"؟ کہا اور پھر اُس نے سر اور ہاتھ ہلا دیے گویا وہ اُس کا مطلب سمجھ گیا ہو۔ اور پھر لبنتو اُس کی مزید پرواہ کیے بغیر اپنے اوزاروں کے بکس میں سے کوئی پرزہ تلاش کرنے لگا۔

یکایک مشینوں کے شور میں اضافہ ہوا۔ ایک نیا سُر، ایک نئی لے جیسے پرانے شور میں آ کر ہم آہنگ ہو گئی ہو۔ سٹیم کے ساتھ ساتھ بجلی کی قوت سے

چلنے والی اور دوسری مشینیں ایکا ایک کام کرنے لگیں۔ چین پر لگے ہوئے ڈبوں کی قطاریں اپنی اپنی منزل کی طرف رینگنے لگیں۔ بڑے بڑے دیوجسامت پیپوں میں جن میں منوں پھل منٹوں میں اُبالا جا سکتا تھا اسٹیم چنگھاڑنے لگی پھل کاٹنے والی مشین کھٹ کھٹ کرتی پھلوں کے پھانٹ پھانٹ کر ٹکڑے کرنے لگیں۔ بڑے بڑے سیمر چشم زدن میں پھلوں سے بھرے ہوئے ایگزامسٹ شدہ ڈبوں کو بند کرنے لگے اور ڈبے رینگتے رینگاتے اپنے جسموں پر لیبل لگواتے ایک عجب شور پیدا کرتے لکڑی کی پیٹیوں میں تھک کر گر جاتے۔

سٹیم کی ہنگامہ خیز شوں شوں، مزدوروں کی ملی جلی چیخیں اور نیٹی آوازیں، بڑے بڑے چمڑے کے پٹوں اور پلیوں کی گڑ گڑاہٹ سیٹم کھولتے ہی یوں معلوم ہونے لگا جیسے یکدم زندگی جاگ اُٹھی ہو۔ بلنتو کے چہرے پر ایک ناز بھری مسکراہٹ تھی اور وہ ان مشینوں کی طرف فخر سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ہی اس زندگی کا خالق ہو۔ اُس کے چہرے کی جھریاں اُسکے مسکراتے ہوئے کھلے ہونٹوں کی وجہ سے گالوں کے قریب زیادہ گہری ہو گئیں۔ اُس نے ہاتھوں کو سینے کے قریب لا کر کنڈلی ماری اور فخریہ نگاہوں سے بائلر کے نیچے لگے ہوئے واٹر گیج کی طرف دیکھنے لگا جس میں پانی لیٹوں کی مسلسل تھرتھراہٹ سے اوپر نیچے ناچ رہا تھا۔ سارا کارخانہ بائلر کے اشارے پر ناچ رہا تھا اور بائلر اُس کے اشارے پر ناچتا تھا ——!

دھوپ تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ بائلر کے آگے لگا ہوا ٹن کا تپتا ہوا سائبان اور بھٹی کے سرخ شعلوں اژدہوں کی طرح گرم گرم سانسیں بکھیر رہے تھے

کارخانے کے احاطہ میں سامنے لگا ہوا آم کا سایہ دار درخت اُسے اپنے سایہ تلے بیٹھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اُس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اُس نے اپنی واسکٹ اور کرتا اُتار دیا لیکن گرمی جیسے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ پسینے کے لمبے لمبے دھارے اُسکے جسم پر گدگدی کا عجب احساس پیدا کرتے اُسکی دھوتی کے بلوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اُس کا سر گرمی سے چکرا اُٹھا اور وہ سائبان سے ہٹ کر پیڑ کی چھاؤں تلے بیٹھ گیا۔ ٹھک، ٹھک، ٹھک۔ ٹھک بائلر کی پسٹیں اپنا پرانا راگ الاپ رہی تھیں۔

زندگی کے چالیس قیمتی سال —— ہاں پورے چالیس سال اُس نے بائلروں کے ساتھ گزارے تھے۔ جب وہ محض بارہ برس کا تھا تو اُسے بائلر کی بھٹی میں کوئلہ جھونکنے پر لگا دیا گیا تھا۔ صرف ڈیڑھ آنے روز پر۔ پھر رفتہ رفتہ اُسکی اور بائلر کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ اُس کے کل پرزوں سے واقفیت حاصل کرتا گیا اور آج وہ اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ زندگی کے اس عرصے میں اُسے بائلر سے ایک آدھ بار مات بھی کھانی پڑی۔ تقریباً دس سال پہلے وہ یونہی گھڑی کے پاس کھڑا تھا جبکہ کسی بولٹ کے ڈھیلا ہو جانے کی وجہ سے سٹیم کی ایک پچکاری اُس کے کانوں میں گھُس گئی اور وہ بہرا ہو گیا۔ چند سال تک بہرہ پن کا احساس اُسکے ذہن کو موقعہ بے موقعہ کریدتا رہا اور پھر اُس نے ہار مان لی لیکن بائلر کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ بدستور اُسی طرح اپنی زندگی کو بائلر کی سیاہ توند سے چمٹائے ہوئے تھا عرصہ ہوا اُس کی بیوی مر گئی تھی اور اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اب صرف وہ تھا اور بائلر ——

بائلر تھا اور وہ۔

تقریباً دو سال ہوئے اس کارخانے کا بائلر خراب ہوگیا تھا۔ سیزن زوروں پر تھا اور کارخانہ کا مالک نئے بائلر کا انتظار نہ کرسکتا تھا۔ انجینیروں کے مشورہ کے مطابق اُسے بالکل ردّی قرار دیا جاچکا تھا اور تب اسے لبنتو مستری نے دیکھا۔ اُسے اسکے ٹھیک ہونے کی مبہم سی اُمید نظر آئی۔ اُس نے اس کے چند ایک پُرزے بنوائے، چند ایک مرمّت کیے اور دن رات ایک کرکے بائلر کو پھر سے چالو کیا۔ کارخانے کے مالک ریوتی بابو اُس پر اتنا خوش ہوئے کہ اُسے فوراً کارخانے میں ملازم رکھ لیا اور جب بائلر ٹھیک ہوگیا تو ریوتی بابو بالکل بھول گئے کہ انہیں نئے بائلر کی پھر کبھی بھی ضرورت پڑیگی!

لبنتو کو جتنے بائلروں سے واسطہ پڑا تھا اُن سب میں سے اُسے کارخانے کا بائلر عزیز تر تھا۔ شاید اِسی لیے کہ یہ بائلر اُس کی اپنی قابلیت کا ضامن تھا۔ اُسے اس بائلر سے بیحد اُنس ہوگیا تھا۔

وہ صبح تڑکے ہی سات بجے بائلر کے گرد منڈلانے لگتا حالانکہ فیکٹری کے اوقات آٹھ بجے سے تھے۔ ابھی پھلوں کی گاڑیاں دروازے پر ہی ہوتیں جبکہ وہ بائلر کو پھونکنے اور صاف کرنے کے بعد اُس میں آگ کی آہوتی دینے کو تیار ہو جاتا۔ اُسکے ساتھی اُس سے اکثر پوچھتے کہ آخر وہ اتنے تڑکے سے ہی کیوں چلا آتا تھا؟ وہ اُن کا سوال سُن کر مسکرا دیتا اور بائلر کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتا۔ وہ دھیرے دھیرے بائلر کی بیرونی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگتا جیسے وہ کوئی جاندار چیز ہو۔ پھر وہ اسکا ایک جھیتھڑے کو

تیل میں بھگو کر بائلر کے جسم پر مالش کرنے لگتا۔ پھلوں سے لدی ٹوکریاں کارخانے کے کھوکھا پیٹ میں گم ہوجاتیں اور شام تک ڈبوں میں بند ہوکر بالکل نظروں سے اوجھل ہوجاتیں۔

یکایک وہ اُٹھ کھڑا ہوا اُس نے قریب سے گزرتے ہوئے کیشب بابو کو سلام کیا۔ وہ اس کارخانے کے فروٹ ایکسپرٹ تھے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے اُسکے سلام کا جواب دیا اور چک اُٹھاکر اپنے کمرے میں چلے گئے وہ پھر بیٹھ گیا۔ اُسکی نگاہیں احاطہ میں لگے ہوئے پیپل کے درخت کا جائزہ لینے لگیں جب صبح ہوتی تو سورج کی شرمیلی کرنیں بوڑھے پیپل کے پتوں میں سے دھیرے دھیرے جھانکتیں اور شام کو سورج دن بھر کی مسافت طے کرتا اس پیپل کے درخت کے پیچھے چھپ جاتا۔ اس درخت پر بہت کم پتے تھے اور ابھی نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی سیندھوری روشنی میں درخت پر لگے ہوئے پھل آگ کی گیندوں کی طرح چمک کر ایک عجیب بہار دکھاتے۔

یکایک اُسے فورمین کی گرجتی ہوئی آواز فیکٹری کے شور وغل میں سے سُنائی دی۔ وہ مادھو کو بیوجہ ڈانٹ رہا تھا۔ بیوجہ! ہاں وہ جانتا تھا۔ لبنتو کی آنکھیں نیچے سُرخ ہوگئیں۔ مادھو ہی فیکٹری بھر میں ایک دوسرا شخص تھا جس نے دلیرانہ طور پر لبنتو کے ساتھ فورمین کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ بے معنی غصہ صرف اُس کو تنگ کرنے کے لیے تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا یا تو اُسے پھر مجبوری طور پر فورمین کے بھائی کی دوکان کی سڑن لینی پڑیگی یا فورمین کا حق...... خوشی خوشی ادا کرنا ہوگا

اور یا پھر اُسے ایک دن نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ لبنتو سوچنے لگا۔ اگر فورمین کا بس چلتا تو وہ لبنتو کو پچھلے ہفتہ اُسی دم فیکٹری سے نکلوا چھوڑتا لیکن فورمین ریوتی بابو سے یوں صاف صاف ٹکر نہ لینا چاہتا تھا۔ لبنتو کو معلوم تھا کہ صرف ریوتی بابو ہی اُس کی قدر جانتے تھے۔ پچھلے سال اُس نے کارخانے کی بہت سی مشینیں بنانے میں مدد دی تھی۔ اگر یہی مشینیں امریکہ سے منگوانی پڑتیں تو ریوتی بابو کو دس گنا زیادہ دام دینے پڑتے اور یہی سب سوچ کر فورمین کی لبنتو سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی۔

فورمین کی آنکھوں میں ہمیشہ شیطنت جھلملاتی جب وہ اپنی تیوری پر بل ڈال کر اپنے دانتوں کو بھینچ کر کرخت آواز میں ڈانٹتا تو فیکٹری کے مزدوروں کے دل سہم جاتے اُسے ان بھولے بھالے مزدوروں کو تنگ کرنے میں ایک عجب لطف آتا۔ وہ چکر لگاتے لگاتے کسی اچھے بھلے مزدور کو کام کرتے ہوئے اس زور سے تھپتھپاتا کہ وہ تڑپ اُٹھتا اور جب اُس کا غصّہ بھرا چہرہ فورمین کے شیطانی چہرے کو اپنے سامنے ہنستے ہوئے پاتا تو وہ مجبوراً مسکرا دینے کی کوشش کرتا۔ درد کی ٹیسوں میں ایک بناوٹی مسکراہٹ! فورمین اُسے دیکھ کر اور بھی ہنسنے لگتا اور پھر وہ کسی ستائے ہوئے مزدور کو اس زور سے تھپتھپاتا کہ وہ بلبلا کر چیخ اُٹھتا۔

"کیوں بے حرامخور۔ عیش کرنے آتے ہو یہاں تم لوگ؟"

لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مزدوروں کے دل میں کارخانے کے مالک کے لیے بہت عزّت تھی برخلاف فورمین کے جب کبھی ریوتی بابو

کارخانے میں چکر لگانے آتے تو وہ ہر مزدور کے پاس ٹھہر ٹھہر کر پوچھتے۔

"کیوں بھائی بھولا؟ مزے میں تو ہو؟ کہو لبنتو کیسا کام چل رہا ہے؟ دلارے اب تو تمہارے گھر میں سب ٹھیک ہیں اور دُکھی لعل تمہیں ابھی تک کوئی رہنے کی جگہ نہیں ملی۔ خیر کوئی بات نہیں پھاٹک کے قریب کوٹھری خالی ہے نا تم اُسی میں آجاؤ"

ہر مزدور کا چہرہ ایک عجیب مسکراہٹ سے تمتما اُٹھتا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ مالک کے لیے کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا وہ فورمین کے بنائے ہوئے زخموں کو بھول جاتے کبھی کبھی اُن کے جی میں آتا کہ وہ فورمین کے خلاف ریوتی بابو سے سب کچھ کہہ دیں لیکن نہ جانے اُنکے الفاظ حلق میں ہی کیوں اٹک جاتے۔

اور پھر درخت کے سائے تلے بیٹھے ہوئے لبنتو کو یکایک معلوم ہوا جیسے بائلر اسے بلا رہا ہو۔ اُسے شک گزرا جیسے بائلر میں اچانک کوئی خرابی واقع ہوگئی ہو۔ وہ جلدی سے بائلر کے قریب آیا۔ بائلر کی گھڑی کی سوئی نیچے بیٹھتی چلی جا رہی تھی۔ سٹیم کا دباؤ گرتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

"پتہ کیا چلے خاک؟ بہرے ہو بہرے۔ کوئلہ بجھنے کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ بھٹی کے کوئلے تو ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ دباؤ کیسے کم نہ ہو؟" لبنتو نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ فورمین قریب کھڑا گرج رہا تھا۔ کوئلے سچ مچ بجھ گئے تھے

بائلر کا تلا بے تحاشا ٹپک رہا تھا۔

"بائلر کی ٹیوبیں چمک رہی ہیں" لبنتو نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم تو سٹ میں جاکر بیٹھ رہو۔ بائلر میں پانی نہ رہیگا تو ان ٹیوبوں کے جوڑ کھلیں گے ہی!" لبنتو کو ایسے معلوم ہوا جیسے فورمین کی شیطنت اُس سے انتقام لے رہی ہو۔

"ہیں ؟"

"ارے پانی نہ رہیگا تو جوڑ کھلیں گے ہی ؟" اور پھر لبنتو نے چونک کر دیکھا۔ واٹر گیج میں پانی کا نام ونشان نہ تھا اور وہ بائلر کو نل کے ساتھ جوڑنا بھول گیا تھا۔ اُس نے نظریں نیچی کرلیں تاکہ فورمین کو خرابی کی وجہ معلوم نہ ہو لیکن جیسے وہ اس بات کو تاڑ گیا ہو۔

"ارے پانی آئے بھی کہاں سے! کام میں تو دھیان ہی نہیں رہتا۔ جلدی سے ٹھیک کرواسے ؟" فورمین غرّایا۔

"یہ جلدی ٹھیک ہونے کا نہیں بابو۔ یہ سب کھولنا پڑے گا" لبنتو نے سہمے لہجے میں کہا۔

"بائلر کھولنا پڑیگا۔ اس کا مطلب ہے کہ چار پانچ روز کام بند رہے گا" فورمین نے اُس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"اس نقصان کا ذمّہ دار کون ہوگا ؟"

"جی بائلر پرانا ہوچکا ہے ... " اور پھر اُس نے اپنے آپ کو روک لیا جیسے اُس نے نہایت نامناسب بات کہہ دی ہو۔ عین اُسوقت نہ جانے کہاں سے

بائلر کی تمام سٹیم گرجتی۔ چنگاڑھتی نکل پڑی۔ لبنتو کا دل سہم گیا۔ نورین تیزی سے دور بھاگ گیا۔ بھاپ کے بادل چند منٹوں تک بائلر کے گرد منڈلاتے رہے گویا وہ اپنی نئی آزادی پاکر بھی بائلر کی اندھیری گھپ توند میں مقید رہنا چاہتے ہوں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ بھاپ کے سفید بادل اپنی نئی فضاؤں کو خوشگوار پاکر اُن میں تحلیل ہو گئے۔

لبنتو کو ایک دم احساس ہوا جیسے بائلر اُس پر ناراض ہو گیا ہو اور اُس نے اپنے غصّہ کا اظہار اس طریقے سے کیا ہو۔ وہ بائلر کی طرف سہمے ہوئے بچے کی طرح دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" اپنے کمرے میں سے نکل کر کیشب بابو نے پوچھا۔

"بائلر پرانا ہو گیا ہے ..... بائلر پرانا ہو گیا ہے" کوئی مزدور کہہ رہا تھا۔ بائلر پرانا ہو گیا ہے۔ لبنتو کو احساس ہوا جیسے وہ اپنی غلطی بائلر کے سر تھوپنا چاہتا ہو اور اب بائلر اور اُسکے درمیان ایک بلند دیوار کھڑی ہو گئی ہو اُس نے نگاہیں اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ اپنے کیے پر نادم تھا کارخانے کے تمام مزدور دروازے کے باہر سیڑھیوں پر کھڑے اُسکی طرف پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُسے بچاسوں آنکھیں اُسکے جسم کو کریدتی اور لعنت ملامت کرتی معلوم ہوئیں۔ پھر ایکا ایک اُسکی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اُس نے غیر معمولی پھرتی سے بائلر کے نٹ بولٹ کھولنے شروع کر دیے۔

اگلے دن تک سارا بائلر کھُل گیا تھا۔ اُس نے بائلر کی تمام ٹیوبوں میں پانی بھر بھر کر دیکھا۔ جگہ جگہ سے ٹیوبیں ٹپک رہی تھیں۔ اُس نے دن رات

ایک کر کے ان ٹیوبوں کی مرمت کی۔ نہایت محنت سے جگہ جگہ تانبے اور سیسے کے جوڑ لگائے۔ جو ٹیوبیں مرمت نہ ہو سکتی تھیں ان میں پگلا ہوا سیسہ ڈال کر انہیں بالکل بند کر دیا وہ کام کرتے کرتے اکثر بائلر کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھتا جیسے وہ اُس سے معافی کا خواستگار ہو۔ اُسے یقین تھا کہ بائلر اُسے معاف کر دیگا

آخر بائلر پھر فٹ کر دیا گیا۔ چمنی کا سہارا دینے والے تار ایک بار پھر باندھ دیے گئے اور پھر اُس نے سہمے ہوے بائلر میں پانی بھرا، رگڑ رگڑ کر لیٹن صاف کیے اور جھجکتے ہاتھوں سے بھٹی میں آگ جھونک دی۔ آگ کے شعلے دیوانہ وار کانپنے لگے۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ پانچ منٹ۔ دس منٹ اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں کوئی دُعا بڑبڑانے لگا۔ پندرہ منٹ۔ بیس منٹ۔ بائلر کی پیشانی پر لگی ہوئی سوئی اوپر کی طرف جنبش کرنے لگی۔

اُس نے بھٹی کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ بائلر کے پینڈے میں کہیں بھی پانی نہیں گر رہا تھا۔ بائلر ایک مرتبہ پھر ٹھیک ہو گیا تھا!

اگلے روز دوپہر کو کام کر رہا تھا جب ماھوسے نے کہا کہ فورمین بابو اُسے دفتر میں بلا رہے تھے۔ وہ دفتر پہنچا۔ فورمین نے میز پر پڑے ہوے رجسٹر سے نگاہیں اُٹھاتے ہوے کہا۔

"لبتھو! جاؤ۔ چھٹی ہے اب۔ یہ لو اپنا حساب۔ بڑے بابو کو بہرے مستری نہیں چاہیئیں" فورمین کی شیطانی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ تھی۔

"جی"؟

"یہ لو اپنا حساب اور جاؤ چھٹی" لبنتو اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے تنخواہ لے لی اور آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ بائلر کے قریب چپ چاپ کھڑا تھا۔ بائلر کے پسٹن حسب معمول اسی طرح ٹھک ٹھک کر رہے تھے جیسے انہیں لبنتو سے کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ شاید بائلر نے ابھی تک لبنتو کو معاف نہیں کیا تھا اُسکی آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔ اور پھر بائلر کے خلاف اُس کے ذہن میں ایک غصّہ کی لہر دوڑ گئی اُس نے دانت بھینچ لیے۔ بائلر کے قریب کھڑا نیا مستری اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

برآمدے میں ریوتی بابو کیشب بابو سے باتیں کر رہے تھے۔ اُس کے قدم غیر شعوری طور پر اُسی طرف بڑھنے لگے۔ وہ ایک بار ریوتی بابو سے التجا کرنا چاہتا تھا۔

وہ تقریباً پاس پہنچ گیا۔ اُس کے لب کچھ کہنے کے لیے کھلے۔ "جی میں.... دراصل بائلر پر....." اور پھر جیسے اُس کی آواز حلق کی گہرائیوں میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ اُلٹے قدم وہاں سے چلدیا۔ ریوتی بابو باتیں کرتے رہے

لبنتو کو اب رہ رہ کر فورمین پر غصّہ آرہا تھا۔ آخر اُسے لبنتو کو نکلوانے کا موقع ہاتھ آہی گیا اب تو وہ بے روک ٹوک مزدوروں کا خون چوس سکے گا! اب تو اُس کے بھائی کی دوکان ٹھاٹھ سے چلے گی! اب تو وہ مزدوروں کو اپنے شکنجے میں پھنسا سکے گا! احاطہ میں کھڑا فورمین اُسے اپنی کامیابی پر مسکراتا معلوم ہوا۔

اُسکی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ بائلر کے پاس سے گزرا ٹھک ٹھک وہی مسلسل بے ہنگم، بیہودہ سی آواز۔ اُس نے بائلر پر ایک غصّہ بھری نگاہ ڈالی اور پھر آہستہ آہستہ چلدیا۔

ابھی وہ مشکل سے پچاس گز پرے پہنچا ہوگا کہ کوئی چیز ہوا میں گولی کی طرح سنسناتی بائلر میں سے نکلی اور دوسرے لمحہ احاطہ میں کھڑا ہوا فورمین فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ بائلر کا کوئی پرانا نٹ چوڑی گل جانے کی وجہ سے بھاپ کے دباؤ کے زیرِ اثر باہر نکلا تھا اور اُس نے فورمین کو زخمی کر دیا تھا۔ فورمین کی پیشانی سے بے اختیار خون بہہ رہا تھا اور وہ بائلر کھڑا سنسنا تا، قہقہے لگاتا سفید بھاپ کے بادل ہوا میں بکھیر رہا تھا۔

بھرے مستری کا چہرا خوشی سے کھل اُٹھا۔ اُس نے ایک دیوانہ وار قہقہہ لگایا اور پھر وہ پاگلوں کی طرح ناچتا کارخانے کے دروازہ کی طرف بھاگ گیا۔

جھاگ

وہ دُکان کے سامنے برآمدے میں کھڑی بارش کو کوس رہی تھی۔ اُسے چھٹی ہوئے تقریباً آدھ گھنٹہ ہو گیا تھا لیکن بارش رُکنے کا نام نہ لیتی تھی اور وہ بد دماغ مینجر اپنی گرے بیوک میں عرصہ ہوئے چلا گیا تھا۔ بدتمیز کہیں کا اُس نے لڑکی کو گھر تک چھوڑنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا! اُسے رہ رہ کر پچکے گالوں والے گنجے مینجر پہ غصہ آ رہا تھا۔ کتنا بدمعاش تھا! جب وہ نئی نئی آئی تھی تو وہ راستہ میں کار روک کر اُسے ہمیشہ لفٹ آفر کیا کرتا۔ لیکن آج جب مارتھا کے کیس میں اُس سے جھپٹ ہوئی تو وہ چڑ سا گیا تھا اور پھر آجکل تو وہ نیلی آنکھوں والی اینگلو انڈین امیا سے آنکھیں لڑا رہا تھا۔

اُس نے گھوم کر دیکھا۔ لارنس اینڈ کو ڈیپارٹمنٹل سٹورز کے بڑے بڑے لفظ اُس کی طرف گھور رہے تھے۔ اُس کی لمبی باریک کٹی ہوئی بھویں سکڑ گئیں اُسے سٹورز کے سامنے یوں کھڑے کھڑے کوفت ہو رہی تھی۔ اُس نے ایک اُچٹتی نگاہ آسمان پر ڈالی۔ گہرے سیاہ بادل آسمان سے غائب ہو چکے تھے اور اب بارش کم ہو گئی تھی۔ وہ اینگلو انڈین امیا کونٹر کے پیچھے کھڑی کسی گاہک کو آنکھیں مٹکا مٹکا کر ٹائیاں اور کالر دکھلا رہی تھی اور اُس سے پرے گندمی رنگت والی مارتھا چپ چاپ کسی میم صاحب کو ایلاسٹک والا

ریشمی بلاوز پسند کروا رہی تھی۔ باہر شوکیس میں ساڑھی پہنے ہوا ماڈل نئے سٹاک کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ اُسے آج کی بات پر رہ رہ کر جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر بات ہی کیا تھی۔ یہی نا کہ زیادہ بھیڑ ہو جانے کی وجہ سے مارتھا ہر گاہک کو توجہ نہ دے سکتی تھی۔ ایسی حالت میں چاہے وہ نیلگوں آنکھوں والی ایما کیوں نہ ہوتی اُسکے لیے بھیڑ سنبھالنی مشکل ہو جاتی۔ بس اسی بات پر ڈانٹ دیا۔ شاید یہ جان کر کہ بھولی بھالی ہندوستانی کرسچین لڑکی کچھ نہ کہے گی۔ اور مارتھا بیچاری کیا کہہ سکتی تھی اگر وہ نہ اُس کی حمایت کرتی۔ اگر ایسی بات کسی اینگلو انڈین سیلز گرل کے ساتھ ہوتی تو وہ اُس کا دماغ درست کر دیتی۔

لیکن اُس کے علاوہ مینجر دل کا بُرا نہ تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ روزمرّہ نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتا لیکن نہ جانے آج کمبخت کو کیا ہوا۔ اُسے مینجر کے اس غیر معمولی برتاؤ پر سخت غصّہ آ رہا تھا۔ بدتمیز نے کار کا دروازہ کھٹ سے بند کر دیا اور انجن سٹارٹ کر دیا۔ اُس نے اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں جیسے وہ اس لفٹ کی بھوکی تھی نا۔ وہ پیدل بھی گھر جا سکتی ہے! اور وہ اپنی رنگین چھتری کھولے گھر کی طرف چل دی۔ ہاں لیکن یہ تھا کہ ان چند منٹ میں مینجر سارے دن کی تکان اپنے چُست جملوں سے دور کر دیتا۔ اور وہ کچھ دیر تک بھول جاتی کہ اس کے فوراً بعد ہی گھر کی بے رونق زندگی اُسکی منتظر تھی۔

گھر!—— اُس کی پیشانی پر گہرے سلوٹ پڑ گئے اور اُس نے دانتوں سے

اپنا نچلا ہونٹ کاٹ لیا۔ اُسے اِس لفظ سے کتنی چڑ تھی۔ کس قدر بے جان بے رونق اور سرد تھا یہ لفظ! زندگی سے بالکل محروم! یہ خیال آتے ہی اُسکی تیز رَو قدم آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے لیکن پھر وہ چھٹی کے بعد فوراً گھر کے سوا جا بھی کہاں سکتی تھی؟ اُس کے ذہن میں گھر کا خاکہ اُبھرنے لگا۔

ایک معمولی کمرہ جسکے ایک کونے میں کھڑکی کے پاس ایک سپرنگ دار گدے والی کرسی تھی جس پر بیٹھی ماما عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے نظریں جھکائے سارا دن کسی سکنڈ ہینڈ بک سیلر سے خریدے ہوئے ناولوں کی ورق گردانی کرتی رہتی۔ اُن کے منہ میں ہروقت سگریٹ رہتا جس کا دھواں آہستہ آہستہ کمرے کی گھٹی فضا میں تحلیل ہوتا رہتا اُن کے عین سامنے برما سے لائی گئی ایک پُرانی ٹیک وڈ کی تپائی تھی جس کا رنگ وروغن مدتیں ہوئیں اُسے داغ مفارقت دے گیا تھا۔ اُس پر چینی کی ایش ٹرے میں پچاسوں سگرٹ کے بجھے ہوے چھوٹے ٹکڑے بکھرے پڑے رہتے اور قریب ہی ماما کا محبوب ترین سگرٹ ورجینیا ۱۵ کا ٹن پڑا رہتا۔ ماما کی کرسی کے آس پاس دری پر ہر جگہ سگرٹ کی راکھ کے بڑے بڑے دھبے قائم ہوگئے تھے لڑکی کو ماما کی یہ لاپروائی ایک آنکھ نہ بھاتی۔

کھڑکی کی دوسری طرف ایک سپرنگ دار پلنگ تھا جس پر ایک بوسیدہ گدیلا پڑا رہتا۔ اُس کے پرے دو تین کرسیاں اور بید کی نشستیں پڑی تھیں ماما کی کرسی کے دوسری طرف ایک بڑی سی الماری تھی جس میں کپڑے ٹنگے رہتے۔ اس کے علاوہ کمرے میں دو کھونٹیاں تھیں جن پر میلے کپڑے یا پھر

بوسیدہ ہیٹ ٹنگے رہتے۔ الماری کے عین اوپر عیسیٰ مسیح کی ایک تصویر لٹک رہی تھی۔ ماما کی کرسی کے بالکل سامنے پاپا کی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کے عین نیچے ایک بڑا سا میز پڑا تھا جس کے چاروں طرف کرسیاں لگی تھیں۔ یہ میز صبح و شام ڈائننگ ٹیبل کا کام دیتا تھا۔ اسکے علاوہ یہ بطور رائٹنگ ٹیبل یا کبھی کبھار کارڈ ٹیبل کا بھی فرض سرانجام دیتا تھا۔

کرسیوں کی قطار کے قریب ہی اُس کی چھوٹی بہن جولیا چپ چاپ سر جھکائے بلاوز کاڑھنے یا سویٹر بنانے یا فراک سینے میں مشغول ہوتی۔ لزی گھر کی خاموشی سے عاجز آ گئی تھی وہ حیران تھی کہ ماما اور لزی سارا دن اس خاموشی سے تنگ کیوں نہ آ جاتی تھیں۔ جولیا کی انگلیاں بہت تیزی سے چلتیں لیکن اُس کے منہ میں زبان نہ تھی وہ خاموش کام میں مصروف رہتی ـــ چپ چاپ جیسے وہ کسی بڑے آرٹسٹ کی جاندار مجسم تصویر ہو۔ وہ جولیا سے باتیں کرنا چاہتی. سوئٹر کے متعلق. شہر کی رنگینیوں کے متعلق لیکن جولیا سر کی جنبشوں کے سوا کچھ نہ بولتی۔ لزی خود باتیں کرتے کرتے اُکتا جاتی اور وہ اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہتی۔

"جولیا۔ یو ہولی جولیا" اُسکے ہر لفظ سے طنز اور تلخی ٹپکتی اور وہ ان لفظوں کو چبا چبا کر نہایت آہستہ آہستہ کہتی جیسے وہ ہر لفظ کا مکمل مزہ اُٹھانا چاہتی ہو "تمہیں نہ جانے اس کشیدہ کاری اور مشین چلانے میں کیا لطف آتا ہے اور پھر اس طرح چپ چاپ! جولیا۔ اس سنجیدگی کے لیے ابھی کافی عمر پڑی ہے تمہیں ابھی بہت عرصہ زندہ رہنا ہے۔ ہنسو، ناچو، گاؤ۔ زندگی کی مسرتوں کا

لطف اُٹھاؤ۔ تم تو وقت سے قبل بہت بوڑھی ہوتی جارہی ہو ،، اور وہ خود کوئی نئی انگریزی دُھن گنگنانے لگتی۔

جولیا اپنے لمبے سیاہ بالوں کو جھٹکا دیتی اور اُسکی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی...
ایک ہلکی سی مسکان اور اس کے بعد اُس کے جذبات اِس آہنی نقاب کے پیچھے پھر گم ہو جاتے۔ اِس مسکراہٹ کے دوران میں اُس کے سر کے بال ایک عجب ادا سے اُس کے مضبوط دلفریب شانوں پر بکھر جاتے۔ اُس کا سانولا چہرہ اور بھی دلآویز معلوم ہونے لگتا اور اُس کی ٹھوڑی کا تِل ایک عجب بہار کے ساتھ مسکرانے لگتا، اُسکی ہرن جیسی آنکھوں میں چند لمحوں کے لیے ایک نورانی چمک پیدا ہو جاتی —— اور پھر وہ جونہی آنکھیں نیچے جھکا لیتی یہ سب کچھ خواب کی طرح خلط ملط ہو جاتا —— وہی چُپ چاپ جاندار مجسّم تصویر زندگی کی گرمی سے محروم۔ لزی حیران تھی کہ آخر جولیا اتنی سرد کیوں تھی۔ شاید برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی!

وہ آخر تنگ آ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ وہ دروازہ بند کر لیتی اور ریکارڈ بجانے لگتی۔ وہی پرانے ریکارڈ —— یا
اُس نے یہ ریکارڈ پچاسوں مرتبہ سُنے ہونگے
لیکن اُس کا جی نہ اُکتاتا۔ اُس کے پاؤں لاشعوری طور پر تھرک اُٹھتے اور وہ تمام کمرے میں واز کی دُھن پر اِدھر اُدھر ناچنے لگتی۔ کبھی کبھی جب وہ ناچتے ناچتے تھک جاتی تو وہ چاہتی کہ کوئی اُس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹائے اور چلّا کر کہے۔ یہ کیا طوفانِ بدتمیزی ہے۔ اِن ریکارڈوں

کو بار بار سن کر کان پک گئے ہیں۔ لیکن گھر میں تو مردے بس رہے تھے۔ بےجان مٹی کی مورتیں۔ کوئی بھی تو اسے آ کر نہ ڈانٹتا اور چپ چاپ واپس ماما اور جولیا کے کمرے میں آ کر پلنگ میں دھنس جاتی۔ وہ جولیا اور ماما سے بکار الجھنے کی کوشش کرتی لیکن سب بے سود۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان بے جان تصویروں کو تکا کرتی۔ اسے جولیا اور ماما کے چہرے یوں معلوم ہوتے جیسے وہ اس سے کہہ رہے ہوں۔ ہم تمہاری باتوں میں کیوں دخل دیں ہمیں پڑھنا اور سینا پرونا اچھا لگتا ہے تمہیں گانا اور ناچنا۔ تم ناچو گاؤ۔ ہم سب کی راہ الگ ہے۔ پھر ہم کیوں ایک دوسرے کی راہ میں روڑا اٹکائیں فریب۔ زبردست فریب۔ لزی کو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ تینوں اپنی کھوکھلی زندگی کو ملمع شدہ باریک پردوں سے ڈھانپ رہی ہوں۔ اسے اس ظاہری سکون کے نیچے گہرائیوں میں دل کی بیقراری اور زندگی کی تلخیوں کا طوفان موجیں مارتا معلوم ہوتا۔ اسی لیے تو وہ گھر سے دور کافی ہاؤس ایمبسڈر یا کلب کے رنگین بال روم میں اپنے آپ کو کھو دینا چاہتی تھی۔

ٹ ٹ ٹ ٹ ٹ

لزی کی رنگین چھتری کسی مکان کی سلاخ دار کھڑکی سے الجھی۔ چھتری جھک گئی۔ آسمان سے موٹی موٹی بوندیں لزی کے چکنے رخساروں سے پھسلتی سڑک کے کنارے جمع شدہ مٹیالے پانی میں مل گئیں۔ لزی جھنجھلا اٹھی۔

"یہ چھتری ہے یا ...." وہ غصے سے بولی اور پھر چھتری کو سلاخوں میں سے چھڑانے کی جد و جہد کرنے لگی۔ جگہ جگہ سے چھتری کا رنگ اڑ گیا تھا اور

اُس کی کمانیاں ٹیڑھی ہوگئی تھیں۔ اُس نے چھتری کو سیدھا کیا اور سوکھی زمین پر احتیاط سے چلنے لگی۔ اچانک اُس کا پاؤں کیچڑ میں دھنس گیا اور اُس کے کندھے سے لٹکا ہوا بٹوہ اُس کی باہوں میں آ رہا۔ اُس نے بٹوے کو ٹھیک کرتے ہوئے ایک موٹی سی انگریزی کی گالی اُگل دی۔

سڑک پر پانی کی بوندیں ناچ رہی تھیں۔ قریب ہی گندے پانی کے نالے میں بارش کا پانی نہایت زور شور سے بہہ رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے سرخ مکان کے سامنے آکر رُک گئی۔ اُس نے دہلیز کی چوکھٹ سے رگڑ رگڑ کر جوتے صاف کیے۔ چھتری کو ایک طرف ڈال دیا اور جیب سے رومال نکال کر منھ اور بالوں کو تیزی سے پونچھتی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

ماما آرام کرسی پر بیٹھے کوئی بیہودہ کتاب دیکھنے میں مشغول تھیں۔ جولیا چُپ چاپ اپنا بلاوز سی رہی تھی۔ سٹین کی گھڑ گھڑ کے سوا کمرہ بالکل خاموش تھا ــــ بالکل اُسی طرح جس طرح اُس نے راستے میں خیال کیا تھا۔ اُس نے جھنجھلا کر بٹوا پلنگ پر پھینک دیا۔ لیکن کیا مجال جو کسی نے اُس کی طرف پلک اُٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ماما چونک پڑیں "آ گئی لڑکی؟" ماما نے ایک لمحہ کے لیے کتاب سے نظریں ہٹا کر عینک کے شیشوں کے اوپر سے سرسری طور سے دیکھتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحہ اُن کی نگاہیں پھر کتاب پر گڑ گئیں۔ قریب ہی ایش ٹرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا سگریٹ دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ اُس کا بیشتر حصہ جل کر راکھ ہو چکا تھا اور اب راکھ کا یہ چھوٹا سا بیلن نما حصہ اپنے بوجھ کو نہ سنبھال سکنے کے باعث دری پر گرنے ہی والا

تھا۔ تپائی کے چاروں طرف دری پر راکھ بکھری ہوئی تھی۔

لزی کرسی پر بیٹھی اپنی بھیگی جرابیں اُتارنے لگی۔ اُس کی نگاہیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ چھت کی کڑیوں کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا۔ دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اُتر گیا تھا۔ اُسکی نگاہیں عیسیٰ مسیح کی تصویر سے ٹکرائیں، شکستہ حال الماری سے پھسلیں، کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے بوسیدہ کپڑوں سے الجھتیں مشین چلاتی جولیا پر آکر رُک گئیں۔ اُس کے گھنگھریالے بال اُس کی گردن سے کھسک کر اُس کے چہرے کو چھپا رہے تھے۔ جولیا کی مضبوط برہنہ ٹانگیں نہایت تیزی سے مشین کو چلا رہی تھیں اور وہی گھڑ گھڑ کا مسلسل شور کمرے کی خاموشی کو تار تار کر رہا تھا۔

اچانک ماما کی انگلیاں ایش ٹرے کی طرف بڑھیں اور انہوں نے سگرٹ اُٹھا لیا۔ سگرٹ کی راکھ ایک جھٹکے کے ساتھ دری پر گر گئی۔ ماما نے ایک طویل انگڑائی لی اور اپنا فربہ ہاتھ منہ کے قریب لے جاتے ہوئے کہا۔

"لزی پیدل آئی ہو اس بارش میں؟"

لزی کا جی چاہا کہ وہ منیجر والا سارا قصّہ بیان کردے لیکن آخر ماما کو اس سے کیا دلچسپی ہوگی وہ ایک بیجان سی ہاں کہہ کر چپ ہو گئی۔ ماما نے سگرٹ کا ایک کش لیا اُسکے چہرے کی جھریاں سمٹ کر پھر پھیل گئیں اور وہ واپس کتاب کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

لزی جھنجھلا اُٹھی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اُس نے کونے میں سے گراموفون اُٹھا کر میز پر رکھ دیا اور اپنا محبوب ریکارڈ لگا دیا۔ وائر کی دھیمی دھیمی پُرکشش تانیں اُسے دن کی تمام تھکاوٹ دور کرتی معلوم دیں۔ اُس کے پاؤں

بسی بے اختیار جذبے کے ماتحت حرکت کرنے لگے اور وہ ناچنے لگی۔

جب وہ ناچتے ناچتے تھک گئی تو وہ کمرے کے کونے میں پڑے ہوئے قدِ آدم آئینہ کے سامنے رُک گئی۔ اُس نے رقص کا ریکارڈ اُٹھا کر آرکسٹرا کا ایک پیارا سا ریکارڈ لگا دیا اور خود کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ اُس نے ایک نظر آئینہ کی طرف ڈالی۔ اُس کا نرم و گداز جسم آئینہ میں سے اُس کی طرف جھانک رہا تھا کس قدر خوبصورت اور متناسب تھا اُس کا جسم! وہ ٹھٹھک گئی۔ اُس کا جسم جولیا کے جسم سے بھی زیادہ خوبصورت اور پُرکشش تھا لیکن یہ الگ بات تھی کہ جولیا کے خوبصورت گھنگھریالے بال اور اُس کی ٹھوڑی کا تِل اُسکو اور بھی جاذبِ نظر بنا دیتے۔ لیکن اُس کا نکھرا ہوا رنگ جولیا کے سانولے چہرے سے کہیں بہتر تھا اُس نے اپنی ٹھوڑی گلے کے نیچے اپنی چھاتی پر گاڑ دی اور نمایاں طور پر اُبھرے ہوئے گول گول نصف کرّوں کو ناز بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"لی۔ ذی" جولیا کی نقرئی آواز آرکسٹرا کے دھیمے سروں میں گونجی۔

"کمنگ!" اور لزی جلد جلد کپڑے پہننے لگی۔ اُس کا پاؤں آرکسٹرا کے سُر کے ساتھ تال دے رہا تھا۔ اچانک اُس کی نگاہ کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف گئی۔ اُس نے یکدم گراموفون بند کر دیا اور کسی کو جاتے دیکھ کر چلّا اُٹھی

"پال —— کیپٹن پال" اُس نے کھڑکی میں سے اپنا رنگین رومال ہلاتے ہوئے پکارا۔

"او —— لزی سویٹی!" سڑک پر جاتے ہوئے پال نے سیٹی بجاتے ہوئے کہا۔

"کم آن" اُس نے اُسے بلاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ آئینہ کی طرف مڑی اور جلدی سے چہرے پر پاؤڈر کریم لگا کر بال ٹھیک کرنے لگی۔

باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ لزی دروازہ کھول کر ڈیوڑھی کی طرف بھاگی

"ہلو پال۔ کم اِن" اور وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔ جولیا میز پر چائے لگا رہی تھی۔ ماما کتاب پڑھتے پڑھتے ایک ہاتھ سے اپنے گلے میں پڑی ہوئی طلائی زنجیر سے کھیل رہی تھیں۔

"ماما۔ ماما پال سے ملیے" لزی نے اشتیاق بھری آواز میں کہا۔ ماما نے کتاب اُلٹ کر تپائی پر رکھ دی۔ وہ ایک ہاتھ میں سگرٹ پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے ناک کو کھجلاتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اُنہیں پال کی دخل اندازی کسی قدر بُری معلوم ہو رہی تھی۔

"ہیلو مسٹر پال۔ ہاؤ ڈو یو ڈو؟" وہ آہستہ آہستہ لنگڑاتی ہوئی پال سے ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھیں اور پھر گہرا سانس لے کر بڑی میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

"چائے پیجئے گا؟ جولیا ایک پیالہ اور لگا دو" جولیا ایک پیالہ اور لے آئی۔ پال کرسی پر دونوں ہاتھ رکھے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ لزی جولیا کو دیکھ کر یکدم چونک کر بولی۔

"اور پال تم جولیا سے تو ملے نہیں۔ مسٹر پال — ہولی جولیا" اُس نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ہولی جولیا؟" پال نے جولیا کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ جولیا نے لمحہ بھر

کے لیے آنکھیں اُٹھا کر پال کی طرف دیکھا۔ پال نے معمول سے زیادہ دیر تک اُسکا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"ہاں" لزی نے ہنستے ہوئے کہا" یہ سارا دن گھریلو کاموں میں اس قدر مصروف رہتی ہیں کہ انہیں بات تک کرنے کی فرصت نہیں ۔۔۔ بیٹھو" لزی نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا" اور سب بیٹھ گئے۔ جولیا لزی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پال جولیا کے جاذب نظر چہرے کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا تو ہو لی جولیا۔ چائے بنانے کی تکلیف تو گوارہ کیجئے" پال نے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

جولیا نے اپنے دلفریب انداز میں بالوں کو جھٹکا دیا اور چائے بنانے لگی۔ کچھ عرصے بعد جب اُس نے دوبارہ نظر اوپر اُٹھائی تو پال ابھی تک اُسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے اُس کا یوں دیکھنا کتنا اچھا معلوم ہو رہا تھا! پال نے خاکی وردی پہن رکھی تھی اور اُسکے کندھے پر تین ستارے چمک رہے تھے۔

"ماما۔ پال ملٹری میں کیپٹن ہے۔ میری پہلی ملاقات سٹورز میں ہوئی تھی۔ وہ اینگلو انڈین لڑکی آیما پال کو غلطی سے بلاوز کا بنڈل دے رہی تھی" وہ بعد کوشش بھی نیلی آنکھوں والی آیما کے خلاف غصّہ نہ دبا سکی۔

"انہوں نے کچھ نکٹائیاں، رومال اور بنیائن خریدے تھے۔ میں نے بنڈل بنا کر آیما کو کونٹر تک لے جانے کے لیے دیا۔ مارتھا کے ہاں کوئی عورت بلاوز اور لپ اسٹک وغیرہ خرید رہی تھی۔ اُس نے بھی ایک ویسا ہی بنڈل ایما کو دے دیا۔"

"اور پھر اس طرح بنڈلوں میں غلطی ہو گئی۔ خوب!" ماما۔ اپنے چوڑے گال پھیلا کر ہنسنے لگیں۔ ماما جب ہنستیں تو اُن کا سارا جسم ہلنے لگتا۔

"مزہ آجاتا اگر دونوں گھر میں غلط بنڈل لیجا کر کھولتے!" سنجیدہ جولیا غیر متوقع طور پر بول اُٹھی۔ سب ہنسنے لگے۔ پال نے جولیا کی طرف دیکھا۔ جولیا کے گالوں پر لالی پھیل گئی اور وہ سر جھکائے چائے کے چمچ سے کھیلنے لگی۔

لزی نے ماما کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کے سامنے بیٹھیں اپنے گلے میں پڑی ہوئی طلائی زنجیر سے کھیل رہی تھیں اور وہ پال کے لمبے تراشے ہوئے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ ماما کا چہرہ اب بھی اتنا ہی بے رونق اور بے نور تھا لیکن نہ جانے لزی کو کیوں محسوس ہوا جیسے ماما کی ظاہری سنجیدگی کے نیچے کہیں ایک خوشی کی لہر جھلملا رہی ہو۔

پال اُس کے لمبے ہاتھوں پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ لزی نے اپنی مخروطی انگلیوں کو نہایت ناز بھری نظروں سے دیکھا اور پھر چند لمحوں کے لیے ہاتھ اٹھانے کے بعد اپنی لمبی لمبی باریک انگلیاں پال کی توجہ کے لیے میز کی سفید چادر پر پھیلا دیں۔ پال کے عین سامنے میز کے دوسرے سرے پر جولیا پیالہ پکڑے آہستہ آہستہ چائے پی رہی تھی۔ اُسکی نگاہیں میز پر گڑی تھیں اور اُس کے رخساروں پر شفق گوں لالی لہرا رہی تھی۔

کمرہ بیحد خاموش تھا۔ آسمان سے بادل غائب ہو چکے تھے اور نہایت ہلکی سی دھوپ کمرے میں کھلی کھڑکی میں سے اُن کی کرسیوں تک آگئی تھی۔ لزی کو اس خاموشی میں بھی مزہ آ رہا تھا۔ کاش کہ ایسی خاموشی ہر وقت رہتی

بھاگ
لیکن ماما کا چپ چاپ کتابیں پڑھتے رہنا اور جولیا کا خاموش مشین چلانا اُسکے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔ اُسے ایسے معلوم ہوا جیسے کوئی نہایت لطیف سی جھنکار کمرے میں گونج رہی ہو۔ نہایت دبی دبی سی جو سُنی نہ جاسکے لیکن یقینی طور پر محسوس ہوسکے۔ شاید وہی فرشتوں کی موسیقی تھی جسکی بابت اُس نے بچپن میں انجیل مقدس میں پڑھا تھا۔

"ماما" وہ یکدم بول اُٹھی" پال بہت اچھی وائلن بجاتا ہے۔ پال۔ وائلن پر دو ایک نغمے تو سنا دو"

"لزی اسوقت نہیں پھر کبھی سہی۔ اب تو میں آپ کے ہاں آتا رہونگا"

"جی ہاں پہلے جو آپ اتنے وعدوں کے بعد آ کر تھک گئے ہیں اور اگر آج میں نے آپ کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو آپ تو تشریف لا چکے تھے" لزی نے شوخی سے کہا۔

"لزی اب میں وعدہ کرتا ہوں" پال نے انکسارانہ لہجہ میں کہا۔ جولیا نے پلکیں اوپر اُٹھا کر دیکھا۔ لزی پال کے کشادہ جسم کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی گویا وہ اپنی آنکھوں سے اُسے نگل جائے گی۔

"ایک اچھے بچے کی طرح؟ تو خیر میں معاف کرتی ہوں" اس نے بناوٹی جاہ و جلال سے کہا اور سب قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"تو لزی اب کیا پروگرام ہے؟ پکچر چلوگی؟" اُس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرور"

"ماما اور آپ ـــــ ہولی جولیا آپ بھی چلیے" وہ جولیا کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

"نہیں آپ ہو آئیے" ماما نے پال کو سگرٹ پیش کرتے ہوے کہا۔ پال نے سگرٹ سُلگا لیا۔

"اور آپ جولیا ـــــ میرا مطلب ہے ہولی جولیا؟"

"مجھے تو یہ بلاوز ختم کرنا ہے۔ پھر کبھی سہی" وہ اُٹھ کر اپنی مشین کے قریب آ گئی۔

"ارے یہ تو کل بھی ہو سکتا ہے!" پال نے اصرار کرتے ہوے کہا۔

"نہیں آج آپ ہو آئیے۔"

"اچھا تو گڈ نائٹ ماما گڈ نائٹ ہولی جولیا" نہ جانے جولیا کو پال کا بار بار ہولی کہنا کیوں اچھا لگ رہا تھا۔

"گڈ نائٹ"۔ جولیا کی شیریں آواز اور ماما کی بھدی کرخت آواز کمرے کی فضا میں گونجی۔

"آؤ لزی، اُس نے دروازہ کھولتے ہوے کہا۔

ماما کرسی کا سہارا لیتی ہوئی آہستہ سے اُٹھیں اور واپس جا کر اپنے کونے والی کرسی میں دھنس گئیں۔ جولیا چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔ آخر وہ ہولی جولیا تھی نا؟ وہ یہ خیال آتے ہی مسکرا دی۔ جب وہ رسوئی سے واپس آئی تو اُس نے حیرانی سے دیکھا کہ ماما معمول کی طرح پڑھنے کی بجائے کمرہ میں لگی ہوئی مرحوم پاپا کی تصویر کی طرف گھور رہی تھیں۔

"جولیا" وہ ہڑبڑا کر بول اُٹھیں جیسے جولیا نے انہیں چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

"پال کی شکل وشباہت بالکل تمہارے پاپا سے ملتی جلتی ہے وہ بھی اپنے جوانی کے دنوں میں بالکل ایسے ہی تھے۔ وہ یہ کہہ کر جیسے کھوسی گئی۔

"کتنا اچھا لڑکا ہے پال!" انہوں نے تپائی پر پڑی ہوئی کتاب اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر پڑھنے میں مشغول ہوگئیں۔

کمرے میں اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ وہ بجلی جلانے کے لیے دروازہ کے قریب آئی۔ جب وہ واپس مڑی تو اچانک اُس کی نظر کھڑکی کی طرف گئی۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی دھندلی روشنی میں سڑک اور مکان بارش کی وجہ سے دھلے نظر آرہے تھے۔ دور پال اور لزی آہستہ آہستہ جارہے تھے پال کا ایک ہاتھ لزی کی کمر کے گرد تھا! اُسکے دل کو جیسے ایک دھچکا سا لگا اور وہ جلدی سے کھڑکی سے ہٹ گئی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پال اور لزی ایک ہی کلب کے ممبر تھے۔ پال اکثر لزی کو لینے چلا آتا تھا کیونکہ لزی کا گھر کلب کے راستہ ہی میں پڑتا تھا۔ کبھی کبھی لزی کلب سے آنے پر کمرے میں لہراتی دھوپ کی طرح آکر بڑی بیتابی سے کہتی۔

"ماما! آج پال نے مسٹر سٹیونز کو بھی ٹینس میں ہرادیا۔ بڑے کھلاڑی بنے پھرتے ہیں۔ اور کل بلیرڈ میں مسٹر سکاٹ کے وہ دانت کھٹے کیے کہ اب وہ بلیرڈز کھیلنا بھول جائینگے۔ ڈھائی سو کا وہ غضب کا بریک بنایا کہ پوچھو نہیں!"

"ڈھائی سو کا؟ ماما پوچھتیں۔

"ہاں۔ پال ذرا اور گیم امپروکرے تو ہندوستان کا چمپین شپ جیت سکتا ہے"

"سچ" جولیا بڑے اشتیاق سے پوچھتی۔

"ہاں اور کیا!"

ماما مسکرا دیتیں اور اُن کا چہرہ کھل اُٹھتا۔ جولیا کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی اور لزی جوش میں آکر کوئی نئی دُھن گنگنانے لگتی۔

پال کے آتے ہی اس ننھی سی خاموش دُنیا میں ایک انقلاب سا آگیا تھا اب وہ اکثر ڈرائنگ روم میں بیٹھے پال کے متعلق اِدھر اُدھر کی بات چیت کیا کرتیں۔ ماما اب بھی کوئی نہ کوئی کتاب لیے اپنی کھڑکی والی کرسی پر بیٹھ جاتیں لیکن بیشتر وقت کتاب الٹی رہتیں اور اب وہ بڑے ذوق شوق سے سگرٹ کا دھواں ہوا میں پھینکتے ہوئے دن کی مختلف باتوں پر تبصرہ کرتی رہتیں۔ لزی اب اپنے کمرے میں الگ بیٹھنے کی بجائے ماما اور جولیا کے ساتھ بیٹھتی۔ اگرچہ زیادہ تر بات چیت لزی اور ماما ہی کیا کرتیں لیکن جولیا کام کرتے ہوئے نہایت غور سے اُن کی باتیں سُنا کرتی۔

کچھ دنوں سے ماما میں ایک غیر معمولی تبدیلی آگئی تھی۔ اب اُنگوری پر بکھرے ہوئے سگرٹ کی راکھ کے دھبے چنداں بھلے معلوم نہ ہوتے۔ وہ اب بات بات پر جولیا کو جھڑک دیتی۔

"جولیا تم کیسی لڑکی ہو۔ کمرے میں ذرا بھی صفائی نہیں رکھ سکتی۔ تم لوگوں کے کپڑے اِدھر اُدھر پڑے رہتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی سلائی وغیرہ سے فارغ ہو کر ان کو سلیقے سے تو رکھ دیا کرو۔"

ایک دن لزی سٹورز سے واپس آنے کے بعد یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ

ماما کتابوں کی ورق گردانی کے بجائے پسینے میں شرابور کمرہ کی صفائی میں مصروف تھیں۔ وہ کمرے کے درمیان کھڑی ہانپ رہی تھیں۔ دیوار پر لگے ہوئے جالے غائب ہو چکے تھے، دری جھاڑی گئی تھی اور کمرہ کا مختصر فرنیچر نہایت قرینے سے لگایا جا رہا تھا۔

"جولیا۔ ذرا میز پوش اور پلنگ کی چادریں تو لے آؤ۔ اور کمرے میں تو فٹ میٹ ہے ہی نہیں۔ لزی کل تم آتی بار دو تین فٹ میٹ تو لیتی آنا۔ تبھی تو جوتوں کی ساری مٹی کمرے میں چلی آتی ہے۔ کمرہ صاف کیا خاک رہے جانوروں کے رہنے کے قابل بھی تو نہیں ہے یہ کمرہ۔ اور انگیٹھی پوش تو کبھی بدلا ہی نہیں گیا۔ یہ کام تم لوگ نہیں کروگے تو کیا فرشتے کرینگے۔ لزی یہ دیوار پر سے تمام تصویریں اُتار کر صاف کردو"

لزی دل ہی دل میں اس انقلاب پر دنگ رہ گئی۔ وہ خاموشی سے تصویریں اُتار کر صاف کرنے لگی۔ اُس نے جب کبھی ماما سے صفائی کے بارے میں کہا تھا تو ماما نے ہمیشہ نیم دلی سے جواب دیا "ہو جائیگی۔ آج نہیں تو کل سہی" پھر بھی جب کبھی لزی کو موقعہ ملتا تو وہ ہفتے میں ایک آدھ بار تھوڑی بہت جھاڑ پونچھ کر دیا کرتی۔ لیکن آج تو وہ ماما کے جوش کو دیکھ کر بالکل حیران ہو گئی تھی۔ ماما خود دروازے اور کھڑکیوں کو پونچھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ماما نہ جانے کہاں سے کرسیوں پر رکھنے کے لیے گدے نکال لائیں۔

"جولیا اندر بڑے ٹرنک میں سے ان کے لیے غلاف تو لے آنا۔ میں ذرا نہا لوں" یہ کہہ کر ماما غسل خانے کی طرف چلدیں۔

لزی ماما سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن وہ ڈر کے مارے نہ پوچھ سکی
جب ماما چلی گئیں تو اُس نے جولیا سے پوچھا۔
"کیوں جولیا.... آج.... کچھ خاص بات ہے کیا؟"
"نہیں تو۔ ویسے ہی ماما پر کبھی کسی بات کا بھوت سوار ہو جاتا ہے"
اور پھر چند لمحے رُکنے کے بعد کہا" کمرے ذرا صاف ستھرے نظر آئیں تو کیا بُرا ہے!"

ایسے الفاظ لزی نے پہلے تو کبھی جولیا کے منہ سے نہیں سُنے تھے اُس نے بناوٹی طور پر آنکھیں جھنجھوڑتے ہوئے جولیا کی طرف دیکھا اور وہ مُسکرا دی۔ جولیا غلاف نکالنے چلی گئی۔ وہ کوئی دُھن گنگناتی کمرے کی طرف چل دی۔

وہ کمرے میں جاتے ہی سستانے کے لیے پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ چند منٹوں تک آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ پھر وہ اُٹھی اُس نے ہاتھ منہ دھویا اور گراموفون پر ریکارڈ لگا دیا۔ وہی، وہ کپڑے تبدیل کر کے دھن کے ساتھ ناچنے لگی۔ یکایک وہ ٹھٹکی۔ اُس کے سامنے نئے کپڑے پہنے ماما کھڑی تھی۔

"اُف خدا ان لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ لزی تمہارا جی گراموفون سے نہیں اُکتاتا۔ وہی ریکارڈ ہر دفعہ ہر بار۔ اُف یہ ریکارڈ تو میرے لیے عذاب جان بن گئے ہیں"۔ لزی نے گراموفون بند کر دیا۔ ادھر جولیا ہے کہ گھڑ گھڑ کیے مشین چلائے جاتی ہے میں تو پریشان ہو گئی ہوں ان لڑکیوں سے

باہر پال ..... ماما کا دم پھول گیا۔

"او پال!" اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ تالی بجاتی باہر کی طرف دوڑی۔ پال میز پر بیٹھا ہوا تھا اور جولیا مشین چھوڑ کر ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ اُسکی نگاہیں زمین پر گڑی تھیں اور اُس کا چہرہ شدّت جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا۔ پال کے ہاتھ جولیا کی طرف بڑھے ہوئے تھے شاید وہ کوئی چیز بیان کر رہا تھا پھر شاید..... وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔

"پال!" اُس نے لرزتی آواز دی اور پھر ایکا ایک اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ پال نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیے۔

"ہیلو لزی" پال نے نہایت اطمینان سے کہا۔ جولیا کی جھکی ہوئی لانبی پلکیں ایک لمحہ کے لیے اُٹھیں اور پھر میز کی سفید چادر پر گڑ گئیں۔ اُس کی انگلیاں گلدان میں لگے ہوئے پھولوں سے کھیلنے لگیں۔

لزی چپ چاپ کھڑی ہو گئی اور جولیا کی طرف دیکھنے لگی۔ جولیا نے پیازی رنگ کا بلاوز اور چوخانہ دھاری والی لال سی سکرٹ پہن رکھی تھی۔ یہ جوڑا جولیا خاص خاص موقعوں پر ہی پہنتی اور وہ اس لباس میں خوب جچتی۔ اتنے میں ماما کمرے میں داخل ہوئیں اور میز کے کنارے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ جولیا اُٹھی اور چائے تیار کرنے کے لیے اندر چلی گئی۔

"اوہ آج تو یہ کمرہ پہچانا نہیں جاتا" پال نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "بہت دنوں سے گندہ ہو رہا تھا۔ یہ لڑکیاں کچھ خیال ہی نہیں کرتیں آج بڑی مشکل سے صفائی ہوئی ہے اسکی" ماما نے اپنی کرخت آواز کو نرم

بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لزی کو ماما کا یہ "بیان" کچھ عجیب سا معلوم ہوا اور دل ہی دل میں مسکرا دی۔ اُس نے بھی ایک کرسی گھسیٹ لی اور بیٹھ گئی۔ اُس کی نگاہیں ماما کے کپڑوں کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ حیران تھی کہ آج اتنے سالوں کے بعد ماما نے اپنے لباس میں احتیاط برتی تھی۔ یہ وہی کپڑے تھے جو ماما نے پاپا کی موت کے بعد شوخ کہہ کر ٹرنک میں علیحدہ رکھ دیے تھے۔ اسکے علاوہ ماما کے بھی بال کچھ سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اُسکے گلے کا کٹاؤ بھی کچھ ضرورت سے زیادہ نیچا تھا۔ اُسکے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں سگرٹ تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے گلے میں پڑی ہوئی طلائی زنجیر سے کھیل رہی تھیں۔ ماما ہر چند لمحے کے بعد کش لیتیں۔ وہ دھوئیں کے لطیف پردے میں سے نہایت غور سے پال کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

جولیا نے میز پر چائے لگا دی اور وہ پیالوں میں چائے بنانے لگی۔

"پال۔ آج تو کلب میں ڈانس ہے۔ چلو گے؟" لزی نے پال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" جولیا کو تو ڈانس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں" اُس نے پیالے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں جولیا؟" پال نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈانس اچھے نہیں لگتے۔ مجھے تو آرکسٹرا کی دھنیں سننے میں صرف مزا آتا ہے خاص طور سے وائلن پر" لزی جانتی تھی کہ جولیا صاف جھوٹ بول رہی ہے۔ اُسے تو صرف کشیدہ کاری میں لطف آتا ہے!

"ہاں پال اُس روز تم نے وائلن سُنانے کا وعدہ کیا تھا۔ یاد ہے نا؟"

لڑکی نے شوخی سے کہا۔

"بہت اچھی طرح"

"تو میں ابھی وائلن لائی" وہ اپنے کمرے میں وائلن لانے کے لیے بھاگی

"ارے چائے تو پی لینے دو" ماما نے پیار سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"ہاں ماما چائے کے بعد ہی میں کہہ رہی ہوں" لڑکی کی اپنے کمرے میں سے آواز آئی۔

چائے کے بعد ماما اپنی کرسی پر جا بیٹھیں۔ ہال جو لیا کے عین سامنے کھلی کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ لڑکی وہیں پڑی ماما کی ٹانگوں پر پیٹھ کا سہارا لیے بیٹھ گئی ہال نے وائلن بجانا شروع کیا۔ پہلے دھیمے دھیمے اور پھر جوں جوں وائلن کی آواز سماعت اور گہری ہوتی چلی گئی اور ایک پُرسوز نغمہ فضا میں گونج اٹھا۔ ایک ایسی بندش جو اپنی شیرینی کے لحاظ سے دل کی گہرائیوں میں اترتی گئی۔ لڑکی بیٹھے بیٹھے کرسی کے بازو پر آہستہ آہستہ تال دے رہی تھی۔ جولیا اپنی ٹھوڑی کے گرد ہاتھوں سے پیالہ بنائے بڑے انہماک سے کپکپاتے گز کی طرف دیکھ رہی تھی جو کہ بڑی چابکدستی کے ساتھ کبھی اوپر اور کبھی نیچے تاروں سے رگڑ کھا کر ایک لاثانی نغمہ پیدا کر رہا تھا۔

لڑکی نے اپنا سر ماما کی گود میں ڈھلکا دیا۔ موسیقی اس کے کانوں میں مدھم ہوتی چلی گئی جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کی نگاہیں ماما کے چہرے پر گڑ گئیں۔ ماما کے چہرے کی جھریاں بالکل مدھم معلوم ہو رہی تھیں اور ان کے چہرے پر بڑھاپے کی بجائے ایک عجیب سی سرخی دمک رہی تھی۔ ماما کا سانس تیز تیز

چل رہا تھا اور اُسکی نگاہیں گز کے ساتھ ہلتے ہوئے پال کے چہرے پر جمی تھیں۔ بھاگ

لزی کو ماما کا چہرہ نہایت پیارا معلوم دیا۔ اُس کا ہاتھ لاشعوری طور پر ماما کی ٹھوڑی تک پہونچ گیا۔ وہ اُسکے چہرے کو سہلانے لگی۔ ماما کی جلد کس قدر نرم تھی! اُسے ہاتھ پھیرتے یوں معلوم ہوا کرتا گویا وہ کسی صابن کا جیتا جاگتا اشتہار ہو اُس کا ہاتھ ایک لمحہ کے لیے کپکپایا۔ ماما کی سرد جلد خلافِ معمول گرم تھی:

یکایک نغمہ ختم ہو گیا۔ پال کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا اور پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگا۔

"کیپٹن" جولیا نے اپنے دلفریب پلکیں اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا، آپ نے تو کمال کر دیا"

"ہرّاہ پال" لزی تالیاں بجاتی اُٹھ بیٹھی۔

"تم تو بہت اچھی وائلن بجاتے ہو پال! بالکل جولیا اور لزی کے پاپا کی طرح" ماما نے آنکھیں جھجھوڑتے ہوئے کہا۔

"پال ہرفن مولا ہے ماما" لزی نے سنجیدہ سا منہ بناتے ہوئے کہا اور پھر وہ یکدم چمک کر بولی، اچھا تو میں بال کے لیے تیار ہو جاؤں؟" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی

"ضرور"

"مجھے معلوم ہوتا کہ تم آ رہے ہو تو میں ایوننگ فراک ہرگز نہ پہنتی"

"میں تو صرف تمہارے لیے چلا آیا" لزی نے ایک لمحہ کے لیے پال کی طرف ناز بھری نگاہوں سے دیکھا اور نہایت خوش اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

ماما نے تپائی پر پڑے ہوئے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "سگرٹ پال"

"اوہ شکریہ" اُس نے سگرٹ لیتے ہوئے کہا۔ پال نے جیب سے لائٹر نکالا اور شعلہ ماما کے سگرٹ کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ" ماما نے ایک پیار بھری نگاہ پال پر ڈالی۔

پال سگرٹ سلگا کر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے جولیا کی نگاہیں اُسکی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی ہوں اُس نے مڑ کر جولیا کی طرف دیکھا وہ جھینپ گئی اور گھبرا کر یکدم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے کچھ اون لینے بازار جانا ہے مسٹر پال آپ مجھے پسند کرنے میں مدد دیجیے گا۔ ابھی لزی تو کم سے کم تیار ہونے میں آدھا گھنٹہ لگائے گی تب تک ہم لوٹ آئیں گے"

"چلیے مجھے کچھ اعتراض نہیں"

باہر اندھیرا تھا۔ سڑک پر دونوں طرف بجلی کے لیمپ جگمگا رہے تھے اُن دونوں کے علاوہ سڑک پر زیادہ لوگ نہ تھے۔ جولیا کو چلتے چلتے احساس ہوا جیسے پال اُس کے چہرے کی طرف نہایت توجہ سے دیکھ رہا ہو۔

"کیا ہے پال؟ کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہارے چہرے کی دلکشی۔ کسقدر خوبصورت معلوم ہو رہا ہے یہ تمہاری ٹھوڑی کا تل!" جولیا شرما گئی "جولیا تم مجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہو؟" اُس نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور پھر اُس نے کچھ لمحوں کے بعد ایکا ایک پوچھا۔

"جولیا تمہیں میری دُھن پسند آئی؟"

"بہت" جولیا نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا۔

"جولیا تم حیران ہو گی کہ میں نے یہ دُھن وہیں بیٹھے بیٹھے بنائی۔ جانتی ہو کہ میں اتنی اعلیٰ دُھن کیونکر بنا سکا؟"

"نہیں تو"

"کیونکہ تم میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ میں صرف تمہاری آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور وائلن خود بخود بج رہی تھی۔ یقین مانو تمہاری آنکھوں میں کسی سحرزدہ دُنیا کے پیغام جھلکتے ہیں۔ تمہارے گالوں میں شعلوں کی تمازت ہے اور تمہارے مسکراتے ہلال نما ہونٹ مجھے دیوانہ بنا دیتے ہیں" اور اُس نے قریب ہی درخت کے سایہ میں اُسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُس کے گرم گرم ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیے۔

جب وہ کچھ دیر بعد اون لے کر لوٹے تو لزی تیار تھی۔ اُس نے ایک خوشنما گلابی فراک پہن رکھا تھا۔

"پال" اُس نے جولیا کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور پھر چہک کر بولی "میں نے سوچا کہ تم مجھے دھوکا دیکر غائب ہو گئے!"

"لزی۔ ایسا کبھی ہو سکتا ہے!"

اور پھر لزی نے جولیا کے ہاتھ میں بنڈل دیکھتے ہوئے کہا "اری جولیا! کیا لائیں؟ اون۔ او یو ہولی جولیا" اُس نے جولیا کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "پال کے لیے بھی ایک سوئٹر بنا دینا۔ اُس دن مجھ سے کہہ رہا تھا!"

"ہاں جولیا ضرور" پال نے تاکید کی۔

"بہت اچھا"

"آؤ پال" اُس نے پال کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "چلو دیر ہو رہی ہے"

٭ ٭ ٭ ٭

دن گزرتے گئے۔ ایک دن رات کا وقت تھا تقریباً آٹھ بج چکے تھے لزی ابھی ابھی پال کے ساتھ کافی ہاؤس سے لوٹی تھی۔ پال کو میس میں پہنچنا تھا اسی لیے وہ راستہ میں سے ہی چلا گیا۔ ماما بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ جولیا پال کا سوئٹر ختم کر کے اندر ہی رکھنے والی تھی کہ اچانک ہارن کی آواز آئی اُس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ پال ایک ملٹری جیپ میں سے کود کر باہر نکل رہا تھا تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"جُو۔۔ لیا۔ باہر کون ہے؟" لزی نے اپنے کمرے میں سے آواز دی

"پال" جولیا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"پال؟" وہ دوڑ کر بڑے کمرے میں آ گئی "ہیلو پال۔ کہو کیا بات ہے؟" اُس نے گھبرائے ہوئے پوچھا

"کچھ نہیں لزی! میری تبدیلی بنگلور ہو گئی ہے اور مجھے ابھی نو کی گاڑی پکڑنی ہے" پال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پال لیکن ابھی تو تم!"..... اُسکے چہرے کا رنگ اُتر گیا۔

"ہاں لزی۔ میں جونہی میس میں پہنچا آرڈرز میرا انتظار کر رہے تھے"

"پال تم دل لگی تو نہیں کر رہے ہو؟" جولیا نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا

"نہیں جولیا" اور وہ اُسکی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

"کیا تم مستقل طور پہ جا رہے ہو؟" ماما نے بھی پوچھا۔ وہ یہ خبر سُن کر

اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اُمید تو نہیں۔ میں جلد ہی لوٹ آؤنگا۔ اچھا تو رخصت دیجیے۔ بیرے نے میرا سامان ٹنک تیار کر کے جیپ میں رکھ دیا تھا"

"اچھا پال۔ خدا حافظ" ماما نے شیک ہینڈ کرتے ہوئے کہا۔

"گڈ بائی ہو ملی جونیا" اُس نے جولیا سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"گڈ بائی"

"گڈ بائی لزی ڈیر" پال نے شیک ہینڈ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لزی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"گڈ بائی پال" اُس کی آواز حلق میں رُک گئی اور پھر اُس نے آہستہ سے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"پال تمہارا سوئٹر!" جولیا کو یکدم سوئٹر یاد آگیا اور اُسنے سوئٹر اُٹھا کر دیدیا

"او جولیا۔ ہاؤ فائن! مجھے یہ سوئٹر آپ لوگوں کی یاد دلاتا رہیگا" اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

ماما چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ قمقمے کی زرد روشنی بالکل بیجان سی معلوم ہو رہی تھی۔ جولیا کو رہ رہ کر پال کے آخری الفاظ یاد آرہے تھے کاش وہ "آپ لوگوں کی" بجائے "تمہاری" کہتا!

لزی کھڑکی میں سے اندھیرے میں غائب ہوتی ہوئی جیپ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پال کی آمد نے گھر کے تینوں افراد کو کسی قدر رنگ لا دیا تھا اور اب جبکہ پال اُن کی زندگی سے دور چلا گیا یہ باہمی رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اُن تینوں کو ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے اُن کی زندگی کا ایک مرکز قائم ہو گیا ہو۔ اُن کی روزمرہ زندگی میں ایک ربط تسلسل اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ ماما اب بھی کتابیں پڑھتیں، جولیا اپنی کشیدہ کاری میں مصروف رہتی اور لزی اپنے کمرے میں آرکسٹرا کی دھنوں پر ناچتی لیکن وہ تینوں پال کے متعلق سوچتی تھیں۔ جولیا گو منہ سے کچھ نہ کہتی لیکن وہ پال کی ہر بات نہایت غور سے سنتی۔ لزی پال کے رنگین قصے مزے لے کر سناتی اور ماما پال کا ذکر آ جانے پر پاپا کی تصویر دیکھتے ہوئے کہتیں "اپنے دنوں میں پاپا بھی بالکل پال کی طرح تھے"۔ لزی کو اب کلب یا کافی ہاؤس وغیرہ جانے میں زیادہ لطف نہ آتا لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی اُسے گھر کی فضا پہلے کی طرح بُری معلوم نہ ہوتی۔

پال کے خط لگاتار آتے رہتے۔ وہ برندابن گارڈنز، کبن پارک، لال باغ اور کنٹونمنٹ کی رنگینیوں کے بارے میں لکھتا لیکن اُس کا جی نہ لگتا۔ وہ جلد از جلد اُن سب کے پاس واپس آ جانا چاہتا تھا۔ اُسے رہ رہ کر جولیا، لزی اور ماما سب یاد آتے۔ اُس نے لزی کے لیے بنگلور سے کچھ پوسٹ کارڈ اور ہاتھی دانت کا ایک خوبصورت ہیر کلپ جس پر کیوپڈ کی تصویر بنی ہوئی تھی بھیجا۔ جولیا کے لیے اُس نے ایک خوشنما مدراسی ساڑی اور ماما کے لیے صندل کا ایک بک ریک بھیجا۔ ماما نے وہ بک ریک اپنی کرسی کے پاس لگا دیا۔ کمرے میں ہر وقت صندل کی خوشبو ہی خوشبو تیرتی رہتی۔ جولیا ساڑی پہنے پھولے نہ سماتی اور لزی کو اپنا ہیر کلپ

بہت پسند تھا۔ اگلے دن جب وہ سر میں لگا کر سٹورز گئی تو اُسے ایسے معلوم ہوا جیسے تمام نگاہیں اُسکے بالوں میں اُلجھ گئی ہوں۔ اُسکی تعریف تو نیلگوں آنکھوں والی ایمانے بھی کی تھی اور وہ گنجا منیجر تو بہت عرصہ تک اُسکی طرف گھور گھور کر دیکھتا رہا تھا

پھر اچانک پال نے لکھا کہ اب اُسے مستقل طور پر بنگلور ہی رہنا ہوگا اور وہ کرسمس میں ضرور آئیگا۔ ایک مبہم سی اُمید سب کے دلوں میں جگمگانے لگی۔ لزی نے کرسمس بال کے لیے ایک نیا فراک بنوایا جولیانے پال کیلیئے ایک خوشنما مفلر بنا ڈالا۔ ماما نے گھر کو دلہن کی طرح سجا دیا۔ خیالی پلاؤ پکائے جانے لگے۔ پکنکوں کا پروگرام بنایا گیا لیکن سب بے سود۔ کرسمس آئی لیکن پال نہ آسکا۔ وہ عین موقع پر بیمار ہو گیا تھا۔ ماما نے خیریت پوچھ بھیجی۔ جولیا اور لزی نے کروٹیں بدلتے راتیں گزار دیں۔ تین ہفتے بعد جواب آیا۔ اب وہ ٹھیک تھا۔ فکر کی کوئی ضرورت نہ تھی اور وہ جلد ہی پہلا موقع ملتے ہی آنیکی کوشش کریگا۔۔۔ اور پھر رفتہ رفتہ خط نہایت مختصر اور دیر بعد آنے لگے

ٌ ٌ ٌ ٌ ٌ ٌ

ایک دن شام کو لزی سٹورز سے لوٹ کر "آن ورڈز ویکلی" کی تصویریں دیکھ رہی تھی جولیا فراک سی رہی تھی اور ماما نہایت اطمینان سے کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھیں۔

"ارے یہ پال کی تصویر!" لزی ایکا ایک چلا اُٹھی۔ جولیا اُسکی طرف دیکھنے لگی "ماما یہ دیکھو پال کی تصویر!" وہ لپک کر ماما کو تصویر دکھلا رہی تھی۔ ماما تصویر کو ہاتھ میں پکڑ کر نہایت غور سے دیکھنے لگیں

"ارے پال نے تو جولیا والا سوئٹر پہن رکھا ہے" جولیا کی آنکھیں فخر سے چمک اُٹھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ماما کی کرسی کے قریب آکر تصویر دیکھنے لگی۔

"کیپٹن پال مارٹن۔ آر۔ آئی۔ اے۔ سی" لزی تصویر کے نیچے لکھی ہوئی عبارت کو بلند آواز میں پڑھنے لگی "جنکی شادی حال ہی میں ایملی سٹینلے سے۔۔۔" پال کے ساتھ ہی دائیں طرف ایک

دوسری تصویر تھی ــــ لزی کی آواز سرگوشی بنکر رہ گئی۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے الفاظ تیرنے لگے کوئی چیز اُسکے حلق میں پھنس گئی اُسکا جی بے اختیار رونے کو چاہا۔ اُسنے ماما کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ وہِسکی بند کر کے تپائی پر رکھ رہی تھیں۔ جولیا واپس مشین پر جا بیٹھی تھی اور فراک سی رہی تھی۔ ماما اور جولیا کے چہروں سے یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ اس خبر سے بالکل متاثر نہ ہوئی ہوں۔ لزی نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ کیا وہی کمزور تھی؟ وہ چپ چاپ اُٹھکر آہستہ آہستہ اپنے کمرے کیطرف چلدی۔ کمرے میں جاکر وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ہاتھی دانت کا بنا ہوا کیوپڈ اُسکے بالوں میں اُسکا منہ چڑا رہا تھا۔ اُس نے کلپ اُتار کر زور سے فرش پہ دے مارا اور پھر ایکا ایک کسی غیر ارادی جذبے کے تحت گراموفون پر ریکارڈ لگا کر ناچنے لگی۔ ناچتے ناچتے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُسکے قدم لڑکھڑا رہے ہوں اور وہ دھم سے اپنے پلنگ پر جاگری۔ اُس نے اپنا منہ تکیے میں چھپا لیا اور زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔

باہر دوسرے کمرے میں مکمل خاموشی تھی ــــ صرف مشین کی گھڑ گھڑ کمرے کے سکون میں خلل ڈال رہی تھی ــــ نہایت آہستہ آہستہ جیسے اُسکا دم اکھڑ گیا ہو۔ مشین پر جھکی ہوئی جولیا کی آنکھیں تر تھیں۔ ماما کے سامنے ایش ٹرے میں رکھے ہوئے سگرٹ کا بل کھاتا دھواں ہوا میں دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہا تھا۔ ماما کی نگاہیں سامنے لگے ہوئے پاپا کی تصویر کے اوپر دیوار کی سفیدی میں کچھ ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یکایک انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور گود میں بند پڑی ہوئی کتاب کو کھول کر پڑھنے لگیں۔

گراموفون فضا میں نہایت میٹھی سریں بکھیر رہا تھا اور لزی کی اونچی سسکیاں اُن کو ڈبو دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

پُل کے نیچے

"اُف کتنی سردی ہوگئی ہے!" لنگڑے راجو نے اپنی گدڑی کو ہاتھ سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا: "سکھو ابھی تک نہیں آیا"

"آتا ہی ہوگا" بھیکو نے چلم سے کش لیتے ہوئے کہا۔ اُس کے منہ اور نتھنوں سے تمباکو کا دھواں آہستہ آہستہ فضا میں گھل رہا تھا: "ابھی تو نو کی گاڑی بھی نہیں آئی؟" بھیکو نے کچھ عرصہ بعد کھانستے ہوئے کہا۔

"میں نے کتنی بار سکھو سے کہا ہے کہ وہ جلدی آجایا کرے"

"آخر فکر کس بات کی ہے۔ راگھو بھی تو ساتھ ہی ہے" بھیکو نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"بھیکو تمہارے گھر میں دُکھ سُکھ ہے۔ اگر یہ لڑکے یہاں ہوتے تو کم سے کم تسلّی تو ہوتی" راجو نے آہستہ آہستہ کہا۔

بھیکو نے جلد جلد چلم سے دو چار کش لیے پھر اس نے ایک تنکا لیکر چلم کے کوئلے کریدے۔ کوئلے ٹھنڈے پڑ چکے تھے وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے ایک طرف پڑے ہوئے کوئلے کے ڈھیر میں سے دو چار کوئلے اُٹھا کر چلم میں ڈالے

"چھی کے پاس جیواں ہے۔ جیواں بڑی تجربہ کار عورت ہے" بھیکو نے ایک طرف پڑے ہوئے چیتھڑوں کو آگ لگاتے ہوئے کہا۔ کپڑے جلنے کی

بدبو جلد جلد فضا میں پھیل گئی۔ آگ کی روشنی سے پُل کے سرنگ نما دروازے کی سیاہی چمک اُٹھی۔ راجو تھوڑا سا کھانسا اور پھر پُل کی چھت کی طرف دیکھنے لگا چھت، گزرتی ہوئی ریل گاڑیوں کے دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھی۔۔ اس برآمدہ نما کمرے کا فرش کچّا تھا۔ راجو عین درمیان گدڑی کو اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹے بیٹھا تھا۔ جلتے کپڑے کی روشنی میں بھیکو کا چہرہ نہایت اچھی طرح سے نظر آ رہا تھا۔ کھلی پیشانی اور بڑی بڑی ڈاڑھی مونچھ میں لپٹا ہوا چہرہ۔ اُس کا چہرہ اُس کے کپڑوں اور نحیف جسم کے برعکس نہایت بشاش معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے جلتا ہوا کپڑا اُٹھا کر چلم میں ڈال دیا اور پھونکیں مارنے لگا۔ قوس نما دیوار پر اُن دونوں کے سائے دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ یکایک یہ سائے دیوار کی سیاہی میں گم ہو گئے اور اُس کی جگہ ایک دبتی ہوئی سرخ سی لَو نے لے لی۔

ریل کے پُل کے چھ دروازے تھے۔ دروازوں میں سے تو ریل کی لائنیں گزرتی تھیں — خم کھاتی ہوئی ...... پل کی دوسری طرف کے دو دروازے اینٹوں سے چنوا دیے گئے تھے۔ پُل کی اُس طرف کے دروازے سے کیبن تک رستہ جاتا تھا۔ اور اُسوقت راجو اور بھیکو نے اُسے اپنی قیام گاہ بنا رکھا تھا۔ دوسرا دروازہ ایک طرف سے چنوا دیا گیا تھا لیکن اُس کی دوسری طرف کُھلی تھی۔ اِس دروازے میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔

"ذرا میں تجھی کو دیکھ آؤں" بھیکو نے جلد جلد کش لیتے ہوئے کہا اور وہ دروازے سے نکل کر بائیں طرف والے تنگ دروازے میں گھوم گیا۔

پانچ سال — پانچ طویل سال لنگڑے راجو نے پُل کے اُس سرنگ نما دروازے میں گذارے تھے۔ لیکن بھیکو کو اُس میں رہتے مدتیں گزر گئی تھیں پہلے پہل اِس سرنگ نما دروازے کو اپنا گھر بنانے کا خیال بھیکو ہی کو آیا تھا سٹیشن قریب تھا۔ اِس لیے بھیکو کو مانگنے کے لیے زیادہ دور نہیں جانا پڑتا تھا۔ پُل کا یہ دروازہ بھیکو اور شاید راجو کے لیے اب بالکل گھر بن گیا تھا۔

گرمیوں میں پُل پر سے ہوتی ہوئی کولتار کی سیاہ سڑک خاموش لیٹی رہتی سڑک سے کولتار کی بدبو آہستہ آہستہ اُٹھ کر فضا میں ملتی رہتی اور یوں معلوم ہونے لگتا جیسے یہ سانس لے رہی ہو۔ جیسے اُس کے سینے سے لاکھوں من بوجھ اُتر گیا ہو اُس میں ایک نئی قسم کی شگفتگی آگئی ہو لیکن سردیوں میں یہی سڑک دم سادھے لیٹی رہتی اور اُس کے سینے پر لاریاں، ٹرک، بیل گاڑیاں اور ریکیے متواتر دوڑتے رہتے۔ سرنگ نما دروازے میں پڑے ہوئے لنگڑے راجو کو ایسے معلوم دیتا جیسے یہ لاریاں۔ ٹرک۔ بیل گاڑیاں اور ٹھیلے پُل پر سے نہیں بلکہ اُس کے سینے پر سے گذر رہے ہوں۔ اُن کی دلخراش آوازیں اُس کے کانوں کو چیرتی ہوئی اُس کے دماغ میں ہتھوڑے کی چوٹیں بن جاتیں۔ جب پُل کی ڈھلوان پر رینگتے ہوئے ٹھیلے اوپر چڑھتے تو اُن کی بھدی اور سخت آواز اُس کے سارے جسم میں ایک پھریری سی پیدا کر دیتیں اور وہ اپنی نظروں کو پُل کی نیم سیاہ چھت پر جما دیتا۔

چھت اور دیواریں زور زور سے لرزتیں اور اُسے کبھی کبھی محسوس ہوتا جیسے وہ دم بھر میں نیچے ہی تو آ رہیں گی۔ لیکن گاڑیوں کے گزرنے کے بعد

وہ پھر ویسے کی ویسے ہو جاتیں۔ راجو میں اُسوقت ایک خاص قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی۔ اُس کے چہرے کی جھریاں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتیں۔ اُسکی پژمردہ آنکھوں میں ایک نئی روشنی آ جاتی لیکن فوراً ہی کسی لاری کے گزر جانے کے بعد پھر وہ سہم سا جاتا اور اُس کے گزر جانے کے بعد پھر ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی بہت بڑی بلا اُس کے سر سے ٹل گئی ہو۔

رات کے وقت سرنگ نما دروازے میں لیٹے ہوئے راجو کو سگنل کی سُرخ بتی ایسے معلوم دیتی جیسے کوئی کانا دیو اپنی انگارہ جیسی سُرخ آنکھ سے غصّے بھری نظروں سے تاک رہا ہو۔ پھر دفعتاً یہ سُرخ بتی ہری روشنی میں تبدیل ہو جاتی اور ایک قوی ہیکل انجن چند ڈبے گھسیٹتا دھوئیں اور بھاپ کے بادل پھیلاتا پُل کے نیچے سے گزر جاتا۔ بھاپ کی ہلکی سی گرم گرم چادر سرنگ نما دروازے کو لپیٹ لیتی۔ اس خوشگوار گرمی میں سب کے اکڑے ہوئے جسم تھوڑے سے ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ غیر ارادی طور پر دیوار سے چمٹ جاتے۔ رات کے وقت گاڑی کا دھواں تاریکی میں جذب ہو جاتا لیکن شام کے وقت جبکہ مغربی حصہ میں لالہ گوں شفق بالکل مدھم پڑ جاتی اور آسمان پر نہ جانے کہاں سے سرمئی سایے لہراتے آ جاتے ہیں دھواں اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتا پل پر لگے ہوئے آہنی کھمبے سے ٹکراتا ہوا فضا کی لطافتوں میں تحلیل ہو جاتا۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ ہلکے سرمئی سائے گہرے ہوتے چلے جاتے حتیٰ کہ وہ آسمان کی وسعتوں پر اپنا تسلّط جما لیتے۔ اور پھر ننھے ننھے تارے اُس سیاہ

چادر میں سے بھانکنا شروع کر دیتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کسی دوشیزہ نے کوئی ملمع شدہ چادر اوڑھ لی ہو۔ اُسوقت پل پر لگے ہوے بجلی کے لیمپ روشن ہو جاتے اور سڑک پر روشنی اور سائے کے کئی دھبے قائم ہو جاتے۔

راجو نے بھی یہ ساکن، منجمد اور خاموش دھبے دیکھے تھے اُسے خود ایسے معلوم دیتا تھا جیسے اُسکی اپنی زندگی بجلی کے دو کھمبوں کے درمیان سائے کے ایک وسیع ٹکڑے کی حیثیت رکھتی تھی ــــ بالکل غیر متحرک اور ساکن، منجمد۔ راجو نے آسمان پر چھائی ہوئی اُن بدلیوں کو بھی دیکھا تھا جو چند گھنٹوں کے بعد بالکل صاف ہو جاتیں لیکن پُل کے اوپر کھمبوں کے درمیان یہ سائے مستقل طور پر بچھے رہتے ــــ بالکل اس کی خاموش اور تاریک زندگی کی طرح۔ اُس نے بچپن میں اپنی ماں سے چلتے پھرتے سایوں کے متعلق سُنا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ دُکھ سُکھ ہمیشہ چلتے پھرتے سایے ہیں۔ پُل کے اوپر۔ سڑک کے کنارے اُس نے لوگوں کو موٹروں میں۔ ٹانگوں میں سائیکلوں پر۔ پیدل اِن سایوں کو عبور کرتے دیکھا تھا۔ لیکن اُسے خود یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اِن غیر متحرک سایوں میں خود منجمد ہو گیا ہو۔ اُسے اپنی گداگرانہ زندگی بھی اِن سایوں کی طرح سیاہ معلوم ہوتی۔ اُسے اُس سے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اس سے دور بھاگنے کی خواہش ہونے پر بھی اُس سے پیچھا نہ چھڑا سکتا تھا۔

پُل کے اِس سُرنگ نما دروازے میں کل چھ آدمی آباد تھے۔ راجو اُس کا بیٹا سکھو۔ بھیکو، اُسکی بیوی بھی، اور اُن کے بچے راگھو منو اور شیاما جسے سب پیار سے شمو کہا کرتے تھے۔ راگھو اور سکھو کی عمر تقریباً دس برس تھی اور دونوں ہم عمر ہونے کی وجہ سے مانگنے اکٹھے جایا کرتے۔ وہ دونوں سٹیشن پر سے کسی گاڑی میں

سوار ہو جاتے۔ سکھو مسافروں کو چند ایک گیت سُناتا اور راگھو دو پتھر کے ٹکڑوں کو بجا کر تال دیتا۔ کوئی رحمدل مسافر خوش ہو کر دو چار پیسے دیدیتا۔ دو تین سٹیشن کے بعد وہ کسی واپس آتی گاڑی پر سوار ہو کر رات کو پھر اپنے سرنگ نما گھر میں آجاتے دن چڑھتے ہی بھیکو اور اُس کی بیوی اپنے سوکھے سوکھے کمزور بچوں کو لے کر اِدھر اُدھر چل دیتے۔ راجو بھی کبھی کبھار پل کے اوپر مانگنے کے لیے چل دیتا۔ لیکن وہ اکثر اپنے دروازے پر ہی رہنا پسند کرتا۔ رات کے وقت سب تھکے ماندے لوٹ آتے اور پھر اپنی اپنی گدڑیوں میں گھُس کر سو رہتے۔ کبھی کبھی زیادہ سردی ہونے پر آس پاس سے سوکھے پتے یا انجن کا جلا ہوا کوئلہ اکٹھا کر لیا جاتا اور عین درمیان آگ جلالی جاتی۔ قریب ہی لائنوں میں انجن کی گرم راکھ میں کبھی کبھار دو تین کُتے آ کر لیٹ رہتے۔ پُل پر ایک عجیب سی خاموشی طاری ہو جاتی اور پھر یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کسی نے تمام کائنات پر خاموشی کا ایک موٹا سا غلاف چڑھا دیا ہو۔ دیوار کے سہارے بیٹھے راجو کو اُس وقت یوں معلوم ہوتا جیسے اِن گدڑیوں میں لپٹے ہوئے جسم گھُلتے چلے جا رہے ہوں۔ اور اِس کمی کو گدڑیاں اُن پر جمی ہوئی مٹی کی تہوں سے پوری کر رہی ہوں۔ راجو کی نگاہیں آہستہ آہستہ گدڑیوں میں سکڑے ہوئے جسموں کی طرف چلی جاتیں۔ مُنو اور بشو کے نحیف جسم اور بے رونق چہرے اُسکی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے۔ بھی کی بے نور آنکھیں اور غمگین چہرہ اُسکی آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا۔ اور پھر کبھی کبھی سکھو اور راگھو کے زور زور سے سانس لینے کی آواز اُسے چونکا دیتی۔ دونوں اس طرح سوتے تھے گویا وہ چھت کی طرف دیکھ رہے ہوں اور شاید اتنی رات گذرنے پر بھی اُن کے خوابوں میں پتھر کے

ٹکڑوں کی مسلسل ٹک ٹک گونج رہی ہو۔ سوتے وقت بکھو کے ہونٹ کھلے رہتے اور یوں معلوم ہوتا جیسے دم بھر میں اُس کے لبوں سے وہ گیت پھوٹنے والے تھے جو سریلے ہونے کے باوجود نہایت غمگین اور افسردہ تھے۔ اُس وقت اُسکے ماتھے کی رگ کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتی۔ اُسکے ہونٹ زور زور سے لرزنے لگتے۔ اُسکی مٹھیاں خود بخود بھینچ جاتیں۔ اُسکی کنپٹی جلنے لگتی اور اُس کا چہرہ سُرخ ہوجاتا کسی غیر اختیاری جذبے کے ماتحت اِس کا دِل پکار اُٹھتا "تم نہیں جانتے مجھے اس زندگی سے کتنی نفرت ہے" اُس کا سارا جسم زور زور سے لرزنے لگتا۔ اُس وقت اُس کے گھٹنوں کے پاس سے کوئی چیز شدت کا درد پہنچا کر اُسے احساس دلاتی "تم کچھ نہیں کرسکتے تم بے بس ہو"۔ راجو کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ احساس اُس کی زندگی پر چھا گیا ہو اور اُس کی آواز کو حلق میں ہی گھونٹ دینا چاہتا ہو۔ اُس کے اکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے اور اُس کا لرزتا ہوا جسم پھر اپنی حالت پر آجاتا۔ اُس کا جوش ٹھنڈا ہوجاتا وہ سوئے ہوئے بچوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ اُن کے خوابوں کی پھیکی ہنسی جو کبھی سوتے سوتے اُن کے لبوں پر کھیلنے لگتی اُس کا تمسخر اُڑاتی نظر آتی۔

وہ چھت پر ٹکٹکی باندھے سوچنے لگتا۔ منو اور ستمو کے زرد زرد بے نور چہرے اُس کے دماغ پر اپنا تسلط جما لیتے۔ کیا یہ بچے اِس کی گداگرانہ زندگی کے لیے ضروری تھے؟ کیا یہ اسی لیے پیدا ہوئے تھے کہ وہ پیدائش کے فوراً بعد ہی اپنے ننھے ننھے ہاتھ آتے جاتے راہگیروں کے سامنے بھیک کے لیے پھیلا دیں؟ یہ سوال کتنی ہی دیر اُس کے ذہن میں منگتے رہتے اور پھر اُس دن جب بھیکو نے

ہنستے ہوئے کہا تھا" راجو اب تم ایک اور بچہ کے چچا بننے والے ہو" تو اُس کا جی چاہا تھا وہ زور سے بھیکو کے منہ پر ایک طمانچہ مارے۔ ایک اور بچہ! زندگی کی کتنی بڑی توہین تھی۔ ایک اور بچہ کو جان بوجھ کر زندگی کے اس دوزخ کی آگ میں ڈھکیلنا کتنا بڑا گناہ تھا۔ کاش یہ تمام بچے پیدا ہونے سے پہلے مرجاتے آخر اڑیاں رگڑ رگڑ کر جینے سے کیا فائدہ! شمو اور منو کے مرجھائے ہوئے چہرے نہایت تیزی سے اُس کے ذہن میں رقص کرنے لگے۔ اُس رات راجو نے بھیکو سے اِس بارے میں کہا تھا تو بھیکو نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔

"راجو۔ اِس دُنیا میں کوئی کسی کو نہیں کھلاتا۔ ہر جیو اپنی قسمت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اگر کسی کی قسمت میں بھکاری ہی بننا لکھا ہے تو ہم تم کیا دُنیا کی کوئی طاقت ایسا ہونے سے روک نہیں سکتی۔

"قسمت!" راجو اُس کی دلیل سُن کر ہنس پڑا۔ "راجو۔ ہماری اِس بے رونق زندگی میں ہے ہی کیا،" بھیکو نے چلم پیتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ "لیکن میں اِس بے رونق زندگی میں سے بھی خوشی کے رس کی آخری بوند چوس لینا چاہتا ہوں" اور راجو کے ذہن میں خیال آیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ سب پل کی دیوار میں سے کسی گزرتی ہوئی گاڑی کی خوشگوار بھاپ کی گرمی کھینچ لینے پر مجبور ہوں۔ راجو کے ذہن میں یہ خیالات پل کے آہنی کٹہرے کی طرف بڑھتے ہوئے دھوئیں کی طرح ہچکولے کھانے لگے۔ اُس کی آنکھیں سیاہ چھت پر جمی ہوئی تھیں جہاں پل کے اوپر لگے ہوئے بجلی کی روشنی نے خوشنما چھت کو روشنی اور سائے کے دو بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اچانک اُسے کسی کے چلم پینے کی

آواز آئی۔ بھیکو اُس کے پاس کھڑا تھا۔ کش لیتے وقت سلگتے ہوئے کوئلوں کی سرخ لو اُس کے چہرے کو روشن کر دیتی۔

"کہو کیا حال ہے ؟"

"بچھی کو بہت تکلیف ہے۔" بھیکو نے جلد جلد کش لیتے ہوئے کہا۔ "بیچاری جیواں اُس کے پیٹ پر مالش کر رہی ہے۔"

"ایسے موقعوں پر درد ہوتا ہی ہے۔" راجو نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ پھر اُس کی نظریں سٹیشن کے دوسری طرف لگے ہوئے سگنل کی سُرخ بتّی کی طرف اُٹھ گئیں۔

"راگھو اور سکھو ابھی تک نہیں آئے !"

"آجکل گاڑیاں بہت لیٹ آتی ہیں" بھیکو نے بیٹھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

یکایک ہوا کا ایک تند جھونکا پُل میں سے ہوتا ہوا نکل گیا۔

"اُف کتنی سردی ہے !" بھیکو نے کہا۔

"بیچاری بچھی کا کیا حال ہو گا ؟" راجو نے کہا۔

"اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ایک طرف سے تو دروازہ چُنا ہی ہوا ہے میں اُس کے قریب آگ بھی جلا آیا ہوں۔" اور پھر جیسے یکایک اُسے خیال آ گیا ہو۔ "ٹھہرو۔ ہم بھی ایک کونے میں آگ جلا لیں۔" یہ کہہ کر بھیکو نے آگ کیلئے کوئلے اور خشک پتے اکٹھے کرنے شروع کر دیے۔

آگ جل چکی تھی۔ راجو بھی آہستہ آہستہ اپنے جسم کو گھسیٹتا قریب سرک آیا

فضا کی خاموشی میں آگ کے شعلے اپنی لمبی زبانیں لیے اِدھر اُدھر ہل رہے تھے
اور اِن لپٹوں کے اوپر چار ہاتھ پھیلے ہوئے تھے — سرد اور یخ بستہ۔ آگ کی
گرمی آہستہ آہستہ اُن کے جسموں پر گلتی جا رہی تھی۔ شعلے آہستہ آہستہ سوکھی ٹہنیاں
کوئلے اور پتّوں کے انبار کو نگلتے جا رہے تھے۔ ڈھیر کے اوپر پڑے ہوئے پتّے
اب بالکل جل چکے تھے۔ لیکن سوائے اسکے کہ اِن کی رنگت سیاہ ہو چکی تھی اُنمیں
کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مردہ جسم! جن میں سے روحیں نکل کر شاید آسمان کی طرف
پرواز کر گئی تھیں۔

دفعتہً راجو اور بھیکو چونک پڑے۔ سٹیشن پر گاڑی آگئی تھی۔ بجلی کے لیمپوں
کی روشنی میں اُنہیں مسافر اُترتے چڑھتے نظر آئے۔ سٹیشن کی اس لمحی ہنگامہ خیز
زندگی میں راجو اور بھیکو کی پتھرائی ہوئی آنکھیں سکھو اور راگھو کی ناکام تلاش
کر رہی تھیں۔

"شاید وہ دونوں آج رائے پور کی طرف چلے گئے ہیں؟"
"وہ گاڑی بھی آنے ہی والی ہے"، بھیکو نے مدھم ہوتی ہوئی آگ کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

راجو نے اپنی نگاہیں آگ کے ڈھیر کی طرف پھیرتے ہوئے نیم سیاہ چھت
پر گاڑ دیں۔ آگ تقریباً بجھ چکی تھی اور جلے ہوئے کوئلوں سے آہستہ آہستہ دھواں
اُٹھ رہا تھا۔ چاند کی زرد زرد کرنیں ریلوے لائنوں کے جال پر پھیلی ہوئی تھیں
بھیکو چلم پیتے پیتے دیوار کے ساتھ سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔ اُسکی آنکھیں نیند سے بوجھل
ہو رہی تھیں۔ پاس والے دروازے میں سے کراہنے کی دبی ہوئی آوازیں

آہستہ آہستہ آرہی تھیں. بھیکو نے آنکھیں بند کرلیں ۔ وہ کچھ دیر تک ایسا بیٹھا رہا حتیٰ کہ اُسے نیند آگئی ۔ وہ سوئے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اُسکے دماغ میں شاید کوئی سنہرا سپنا لہرا رہا تھا!

اچانک ریلوے لائن کی پٹری پر کسی کے چلنے کی آہٹ ہوئی۔ راجو چونک پڑا کوئی آہستہ آہستہ پل کی طرف آرہا تھا۔

"چاچا،" اندھیرے میں کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

"راگھو"! راجو نے اُسے پہچانتے ہوئے کہا: "سکھو کہاں ہے؟" اُس نے اکیلا آتے دیکھ کر پوچھا۔

"سکھو ——" راگھو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا سکھو کو؟" راجو نے اطمینان سے پوچھا۔

"سکھو ——" راگھو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے! "وہ گاڑی کے —— نیچے —— آگیا"۔

راجو نے آہستہ سے اپنی پیٹھ دیوار کے ساتھ ٹیک دی ۔ وہ بالکل خاموش تھا

"میر پور کے سٹیشن پر بہت بھیڑ تھی" راگھو کے لب کانپ رہے تھے "چاچا! میں نے سکھو سے کہا ہم دوسری طرف سے چڑھ جائیں تو بہتر ہوگا۔ سکھو اور میں انجن کی طرف لپکے تاکہ سامنے سے ہوکر دوسری طرف چلے جائیں لیکن گاڑی نے سیٹی دے دی ۔ ہمنے بھاگ کر گاڑی پر چڑھنا چاہا لیکن لوگوں نے ہمیں دھکے دیے ۔ میں تو گرتے گرتے بچا۔ سکھو نے مجھ سے کہا۔ آؤ گاڑی کے نیچے سے ہوکر دوسری طرف چلیں ۔ میں نے اُسے روکا لیکن وہ گاڑی کے نیچے گھس گیا..

اور پھر .... عین اسوقت گاڑی چل دی .... میں چلایا .... !" اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی" میں پھر چلایا ..... تھوڑی دور جاکر گاڑی رُک گئی .... میں بھاگا ہوا وہاں گیا جہاں سکھو گاڑی کے نیچے گھُسا تھا ..... وہاں .... وہاں .... اُف میں نے سکھو کا جسم خون میں لت پت دیکھا۔ تمام جگہ سرخ ہو رہی تھی۔ پُل کے سرے والے شبن کے تربوزوں سے بھی لال ..... چاچا! مجھے بہت ڈر معلوم ہوا۔ میں بھاگا وہاں سے!"

راجو آنکھیں بند کیے دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔ اُس کے لب کھُلے تھے اور چہرے کی رنگت زرد تھی۔ راگھو لیٹ گیا۔ بھیکو ابھی تک سو رہا تھا۔

"چاچا!" راگھو نے کہا: چاچا بولتے کیوں نہیں! اب سکھو کبھی میرے ساتھ نہیں جائے گا؟ سکھو بہت اچھا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے نورو کی دُکان سے ریوڑیاں لے دیا کرتا تھا۔ چاچا نورو کی ریوڑیاں بڑی مزیدار ہوتی ہیں۔ میں تمہارے لیے بھی کسی دن لاؤنگا۔ میرے منہ میں تو اب بھی پانی آ رہا ہے!"

آگ کا ڈھیر اب بالکل سرد ہو چکا تھا۔ ہوا کا ایک تند جھونکا ڈھیر سے جلے ہوے پتوں کی راکھ اُڑاتا دوسری طرف نکل گیا۔ یکایک جیوان دوڑتی ہوئی آئی۔

"بھیکو۔ راجو۔ بھیکو تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے ہاں چاند سا بیٹا ہوا ہے!"

بھیکو نے آنکھیں کھول دیں جیسے اُسکے سپنے سچ ثابت ہو گئے ہوں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیوان واپس دوڑی چلی گئی۔ بھیکو کی آنکھیں کسی نامعلوم خوشی کے زیر اثر چمک اُٹھیں ـــ ایک کونے میں پڑا راگھو اونگھ رہا تھا۔

"اچھا ہوا — اچھا ہوا سکھو مر گیا" راجو ایک کونہ میں آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا: "کاش میں بھی مر جاتا!"

بھیکو نے راجو کی طرف دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے راجو یہ الفاظ عالم خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔ قریب سے سَن کر کے دھواں پھیلاتی ہوئی گاڑی نکل گئی۔ بھیکو غیر ارادی طور پر دیوار سے چمٹ گیا۔ گویا اُس کا جسم اس دیوار میں سے تمام گرمی کھینچ لینے پر مجبور تھا —!

روشنی

شیلا دیر تک اشوک کے جسم کو سہلاتی رہی۔ اشوک کا سر اُس کے زانوؤں میں تھا اُس نے جھک کر آہستہ سے اشوک کے چہرے کی طرف دیکھا وہ دو گھنٹے مسلسل درد سے تڑپنے کے بعد اب سو گیا تھا۔ اس کا معصوم چہرہ دن کی ڈھلتی ہوئی روشنی میں اب بھی بہت پیلا معلوم ہو رہا تھا۔ شیلا نے کمرے کی دیوار کی طرف دیکھا جہاں روشندان میں چھن کر آتی ہوئی دھوپ کا ایک دھبہ رفتہ رفتہ اوپر کی طرف سرک رہا تھا۔

شیلا نے اشوک کا سر آہستہ سے تکیہ پر رکھ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں ماں کی تمام ممتا پگھل کر آ گئی اس کا جی اپنے آٹھ سالہ بچے کو پیار کرنے کے لیے چاہا لیکن وہ اِس کے جاگ جانے کے خیال سے رُک گئی۔ اشوک کو نہ جانے یہ درد کے دورے کیوں پڑا کرتے۔ شیلا اور اس کا شوہر مدن کئی بار اسے بجلی کمپنی کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ لیکن وہ ہر بار اُسے ایک مکسچر دیتا جس سے درد میں افاقہ ضرور ہو جاتا لیکن کچھ ہی مہینوں کے بعد پھر کبھی درد کا دورہ پڑ جاتا۔ شیلا نے کئی بار مدن سے ڈاکٹر متل کو دکھانے کے لیے کہا تھا لیکن اُسے کبھی یونین کے کام سے فرصت ملے تب نا!

مدن آج بھی دوپہر کو آس پاس کے مزدوروں کو اکٹھا کر کے سُرخ جھنڈے لے کر بجلی کمپنی کے سامنے والے میدان میں میٹنگ کر رہا تھا۔ مدن بجلی گھر میں

ایک سپروائزر تھا اور اس کے ساتھ ہی مزدوروں کی یونین کا سکریٹری بھی۔

یکایک شیلا کو باہر میدان سے ایک شور سنائی دیا۔ وہ اُٹھ کر باہر بالکونی میں آگئی۔ مزدوروں کی کچھ اور ٹولیاں نعرے لگاتی میدان کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھیں۔ "ہماری مانگیں پوری کرو!" "کھنہ شاہی نہیں چلے گی" کے نعرے ہوا میں گونج رہے تھے۔ کھنہ صاحب بجلی کمپنی کے جنرل منیجر تھے۔ اور یہ صدائے احتجاج کھنہ شاہی کے خلاف تھی۔

شیلا کے پڑوس کی باقی عورتیں اور بچّے بھی اپنے اپنے دروازوں سے میدان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دائیں طرف کچھ دوری پر بجلی گھر کی چمنیاں شام کی ارغوانی روشنی میں سیاہ دھواں اُگل رہی تھیں۔

سننے میں آیا تھا۔ کہ مزدوروں کی یونین تین مہینے کا بونس مانگتی تھی۔ دس گھنٹے کی بجائے آٹھ گھنٹے کام، تفریح کے لیے کلب اور شفٹ میں کھانا مفت یہ بھی کہا جاتا تھا کہ بجلی کمپنی اس سال خسارے میں رہی تھی تو پھر یہ مانگیں کیسے پوری ہو سکتی تھیں۔ لیکن مدن کا کہنا تھا کہ بجلی کمپنی اس سال بھی خسارے میں نہ تھی بلکہ خسارے کا ڈھونگ مزدوروں کے حقوق کا گلا گھونٹنے کے لیے رچایا گیا تھا۔

شیلا بالکونی کی دیوار کا سہارا لیے میدان میں جمع ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بالکونی سے میدان تقریباً ۲ فرلانگ دور تھا۔ آوازیں اچھی طرح سنائی نہ دے رہی تھیں لیکن فضا میں شور مزدوروں کے جوش کا ضامن تھا۔ اتنے میں جھنڈا لیے ایک شخص پلیٹ فارم پر آیا۔ دفعتاً چند لمحوں کے لیے شور زیادہ ہو گیا اور

پھر جیسے بالکل بند ہو گیا۔ شاید اس کا شوہر مدن تقریر کر رہا تھا۔

یکایک شیلا کو اندر سے ایک چیخ سُنائی دی۔ اُسے اِس ہنگامے میں اشوک کی بیماری کا خیال بالکل نہیں رہا تھا۔ وہ دوڑ کر اندر آئی جہاں اشوک چارپائی پر بیٹھے درد سے دہرا ہوئے جا رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے مکسچر کی ایک خوراک پلائی اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کا پیٹ ملنے لگی۔ اشوک کے چہرے کے انتہائی درد و کرب کے شکن آہستہ آہستہ دور ہونے لگ گئے اور پھر کچھ دیر بعد ٹھیک ہو گیا۔

کمرے میں اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر بجلی جلائی اور ویسے مصمّم ارادہ کر لیا کہ وہ مدن کو پہلی ہی فرصت میں اشوک کو ڈاکٹر متل کے پاس لے جانے کے لیے مجبور کر گی۔ یوں تو مدن کو اشوک سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کے لیے اکثر نئے نئے کھلونے اور کتابیں لاتا۔ شاید شیلا نے کبھی اُسے ڈاکٹر متل کو دکھانے کے لیے ٹھیک طریقے سے مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ یہ سوچتی ہوئی پھر بالکونی پر آ گئی۔

بجلی کمپنی کے چھ بجے والی سیٹی کے ساتھ دوسری شفٹ کے کچھ لوگ بجلی گھر سے باہر نکلنے لگے۔ شام کے سرئی سایوں میں بجلی گھر کی چمنیوں میں سے نکلتے دھوئیں کی لکیر تاریکی میں گڈمڈ ہوتی جا رہی تھی۔ آس پاس کے مکان کے دریچوں میں سے جھانکتی ہوئی روشنیاں شام کے دھندلکوں میں کسی پرستان کی روشنیاں معلوم ہوتی تھیں۔

بجلی کمپنی کے گیٹ کے پاس مدن اور اس کے ساتھی تیسری شفٹ کے لوگوں کو

اندر جانے سے روک رہے تھے۔ مدن خود مزدوروں کو مکمل ہڑتال کے لیے کہہ رہا تھا۔
"جس کھیت سے دہقاں کو میسّر ہو روزی ؛ اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو"
وہ بار بار اقبال کا یہ شعر دہرا رہا تھا۔ بند کر دو اس بجلی گھر کو! اسی میں ہماری کامیابی ہے! بجلی گھر کے اندھیرے میں ہی ہماری روشنی ہے!"
شیاما بالکونی پر کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ایکایک اُسے اشوک کی چیخ پھر سُنائی دی۔ آج یہ اُسے بار بار دورہ کیوں پڑ رہا تھا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا اُس نے بھاگ کر پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پڑوس والوں کا لڑکا مہندر باہر نکل آیا وہ میٹرک میں پڑھتا تھا۔

"اشوک کو پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ مہندر جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ اس کی حالت دوپہر سے سدھر ہی نہیں رہی!"

"آج کمپنی کا ڈاکٹر کہاں ملے گا! مدن بھیّا کو بلاؤں؟"

"آج انکو فرصت کہاں؟ اور پھر وہ ڈاکٹر تھوڑے ہی ہیں!" اور پھر جیسے وہ ایکدم سوچکر بولی۔

"ڈاکٹر متل کو کیوں نہیں بُلا لاتے! وہ بالکل پاس ہی تو ہے!"

"اچھا دیدی" کہتا ہوا مہندر جلدی سے سیڑھیوں میں پڑی ہوئی سائیکل نیچے اُتارنے لگا۔

چند ہی منٹوں میں ڈاکٹر آ گیا۔ ڈاکٹر متل نے اشوک کو اچھی طرح دیکھا اور پھر اس کے ماتھے پر جیسے بل پڑ گئے۔ شیلا اور مہندر کی آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ڈاکٹر بولا۔

"مریض کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"
اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپریشن کل کیا جائے یا آج"؟
"اپریشن!" شیلا چونکی۔ اشوک کی حالت خطرناک معلوم ہوتی تھی۔
"ہاں۔ ہاں معمولی ہے! آپ تھوڑا پانی اُبال لیجئے۔ اُس نے شیلا سے کہا۔
"کیا بتایا آپ نے اپنا نام؟" اُس نے مہندر سے پوچھتے ہوئے کہا۔

"جی میرا نام؟ مہندر!"
"آپ میرے کمپاؤنڈر سے کہیے کہ اپریشن کا سب سامان لے کر فوراً چلا آئے
اپریشن ابھی کرنا ہوگا۔"
شیلا نے رسوئی میں جا کر سٹوو پر پانی گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ
بار بار کانپ رہے تھے اور اس کے دماغ میں کئی طرح کے خیال آ رہے تھے۔
وہ کانپتے ہاتھوں سے گرم پانی کمرے میں لائی۔ ڈاکٹر نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا
"آپ خواہ مخواہ گھبرا رہی ہیں بہت معمولی اپریشن ہے۔ ایسے اپریشن تو
روز کیا کرتا ہوں!" ڈاکٹر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
اتنے میں کمپاونڈر اپریشن کا سامان لے کر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے اپریشن کے اوزار
گرم پانی میں ڈال دیے اور آپریشن کی تیاری کرنے لگا۔ اُس نے اشوک کو انجکشن
لگایا اور پھر مہندر سے ایک ٹیبل لیمپ لانے کے لیے کہا۔
تھوڑی دیر میں ٹیبل لیمپ آ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے مناسب بلندی پر جما دیا
اگلے چند ہی لمحوں میں ڈاکٹر نے اپریشن شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ بلا کے پھرتیلے
تھے۔ وہ واقعی ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ شیلا کا دل اندر سے بہت گھبرا رہا تھا۔

لیکن ایسے موقعوں پر نہ جانے کہاں سے دل میں مضبوطی آجاتی ہے۔ وہ ڈاکٹر کی ہر حرکت کو بغور دیکھ رہی تھی مہندر منہ دوسری طرف کیے ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کا دھیان مکمل طور پر آپریشن میں لگا ہوا تھا۔

دفعتاً کمرے کی روشنی غائب ہوگئی۔ ڈاکٹر عالم محویت سے یکدم چونک کر چلّایا۔

"یہ کیا ہوا؟ کس نے روشنی بند کر دی؟"

شیلا بھاگ کر بالکونی پر گئی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کوئی بھی روشنی نہیں جل رہی تھی۔

"روشنی! لائٹ! جلدی!" ڈاکٹر جھنجھلایا۔

شیلا بھاگ کر رسوئی میں گئی اُسے یاد پڑتا تھا کہ گھر میں کہیں ایک آدھی موم بتّی تھی لیکن نہ جانے وہ کہاں رکھ دی تھی۔ وہ اندھیرے میں جگہ جگہ تلاش کرنے لگی۔ اس کے دماغ میں ڈاکٹر کی آواز "روشنی! لائٹ"! ہتھوڑے کے چوٹوں کی طرح برس رہی تھی۔ پھر اُسے اچانک تیل کی بوتل مل گئی اور اُس نے جلدی سے تیل ایک کٹوری میں ڈال دیا۔ ایک کونے میں پڑی ہوئی روئی اُسے مل گئی۔ وہ جلدی سے دیا جلا کر آنچل سے چھپائے کمرے میں لے آئی اس نے دیا میز کے قریب رکھ دیا۔

"اس روشنی سے کیا ہوگا!" ڈاکٹر جھلّا کر بولا۔ وہ اشوک کے قریب چارپائی پر بیٹھا تھا اور ایک ہاتھ سے اشوک کی نبض دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُس نے اشوک کا ہاتھ نیچے گرا دیا اور پھر اُس کے چہرے پر چادر ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے سخت افسوس ہے"!

شیلا جہاں کھڑی تھی۔ وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی تمام طاقت سلب ہوگئی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چارپائی پر پڑی ہوئی سفید چادر کی طرف دیکھنے لگی اُسی وقت سیڑھیوں پر سے مدن کے دھڑ دھڑ چڑھنے کی آواز آئی۔

"شیلا! شیلا! دیکھا تم نے آج میں نے سارے شہر کی بتیاں گل کرادی ہیں!"

بھنور

اور آج بھی گنگا معمول کی طرح اپنی دھیمی چال میں بہے جا رہی ہے۔ اُسکی ننھّی ننھّی موجیں کھیلتی اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور اُس میں ہزاروں، لاکھوں سورج جھلملاتے ہیں۔ اُس کی سطح پر مکمل خاموشی طاری ہے اور اُس کی گہرائیاں اپنے سینے میں لاکھوں، کروڑوں راز سموئے ہوئے ہیں۔ جنہیں وہ ابد تک افشا نہ ہونے دیگی۔ ہاں ابد تک! لیکن میں دُلارے کا راز جانتا ہوں اور شاید میرے اور گنگا میا کے سوا اس دُنیا میں کوئی نہیں جانتا۔

دُلارا۔ کھیتو۔ جگو اور میں بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے آئے ہیں۔ ہم سب کی عمر چودہ پندرہ برس ہے۔ ہمارا گاؤں گڑھ مکتیشر کے پاس گنگا کے کنارے ہے ہم لوگوں کا بچپن ندی کے کنارے ہی کھیل کود کر گزرا ہے۔ ہمنے گنگا میا کو مختلف روپوں میں دیکھا ہے۔ پھاگن اور چیت کے مہینوں میں تو یہ بیحد سہمی سی ہوتی ہے حتیٰ کہ تمام بسیں اور موٹریں بھی اس کے لمبے چوڑے پاٹ میں سے گزر جاتی ہیں لیکن برسات کے مہینوں میں اس پرسکون اور شانت ندی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور یہ غصّے سے نڑ اُٹھتی ہے۔ اس کا غصّہ سینکڑوں گاؤں کو بہا کرلے جاتا ہے۔ پارسال بھی جب باڑھ آئی تھی تو اس کا پانی ہمارے گاؤں کے زمیندار کے پکے مکان تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن خیر ہوئی کہ پانی جلد ہی اُتر گیا اور

گاؤں تباہی سے بچ گیا۔ ہاں گاؤں کے ندی کے قریب والے حصّے کے کھیت اور کچے مکان بالکل برباد ہو گئے تھے۔ سردیوں میں تو یہ ندی سُکڑ کر محض ایک نالا سا بن کر رہ جاتی ہے اور ایک پردیسی کو تو اچنبھا ہی ہوتا ہے کہ کیونکر اس چھوٹی سی ندی کے بدلتے ہوئے تیور سینکڑوں گاؤں کی تباہی کا کارن بن سکتے ہیں۔ اسکے باوجود بھی ہم سب لوگ اس ندی کے شکرگزار ہیں کیونکہ یہی ندی ہمارے کھیتوں کو نئی زندگی بھی دیتی ہے اور کئی کئی سال تو ہمارے گاؤں میں بہت ہی اچھی فصل ہوتی ہے۔

گنگا میّا سے ہمیں ایک اور بہت فائدہ ہے۔ گنگا میّا اپنی تہہ میں لکشمی کو چھپائے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں تو ہر ندی کی تہہ میں لکشمی نواس کرتی ہیں لیکن گنگا اور اس کی بہنیں اور جمنا تو خصوصاً انہیں بہت پسند ہیں۔ ہر سال ہزاروں لاکھوں یاتری ان ندیوں میں نہاتے ہیں اور اپنی شردھا اور اوقات کے مطابق ان کو روپے پیسے بھینٹ کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت تو ہم لڑکے لوگ ہی دے سکتے ہیں جو کہ دن کا بیشتر وقت ندی کے گرد ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں۔

سُنتے ہیں کہ کچھ سال ہوئے ندی میں ایک زبردست باڑھ آئی۔ گنگا میّا کے ماتھے کے بل بیحد گہرے ہو گئے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا شنکرجی مہاراج اپنا تانڈو ناچ شروع کرنے والے تھے۔ ہمارے گاؤں کا ایک بیشتر حصّہ باڑھ کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا۔ فصلیں، مکان اور مویشی ندی میں بہہ گئے۔ لوگوں نے اپنی جانیں اونچے درختوں پر چڑھ کر پتّے کھا کھا کر بچائیں۔ جب پانی نیچا ہوا تو فصلیں تباہ ہونے کی وجہ سے گاؤں کے بہت سے لوگ شہر میں کام کاج کی تلاش

میں چلے گئے۔ گاؤں کے بچے کھچے لوگوں میں ہماری دادا بھی تھے۔ ہماری دادا پانی میں تیرنا اور غوطہ لگانا خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ ایک دن انہوں نے گنگا میا کی جے پکارتے ہوئے غوطہ لگایا تو نہ جانے کیسے ایک سونے کا کنگن ہاتھ آ گیا۔ پھر کیا تھا، دن ہی پلٹ گئے! انہوں نے غوطہ خوری کو ہی وسیلۂ زندگی بنا لیا۔ اور پھر گاؤں کے لوگوں کو یہ پسند کیوں نہ آتا جو ویسے ہی ندی کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔

ہم چاروں ساتھیوں نے ہماری دادا کی شاگردی کی ہے۔ ہماری دادا پچھلے سال ہی پرلوک سدھار گئے ہیں۔ مرنے سے پہلے انہوں نے ہم سے وعدہ لیا کہ ہم کبھی کسی لاش کی بے حرمتی نہیں کرینگے اور کبھی کسی مردہ جسم سے زیور یا کوئی قیمتی چیز نہیں اُتاریں گے۔ انہوں نے ہمیں بتلایا کہ اُس باڑھ کے زمانے میں انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ جب تک وہ اپنی محنت اور کوشش سے کام کرینگے۔ ان کے "مال" میں ترقی رہے گی۔ لیکن اگر انہوں نے لاشوں کی بے حرمتی کر کے روزی کمانی چاہی تو گنگا میا ایسا کرنے والوں سے بُری طرح پیش آئے گی۔

ہم لوگوں کی کمائی عموماً گرمیوں میں سب سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد محض گرمیوں میں ندی میں نہانے کی قائل ہے۔ جوں جوں موسم تبدیل ہوتا ہے اور سردی بڑھتی ہے، لوگوں کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور پوہ۔ ماگھ میں جبکہ ندی کا پانی بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتا ہے۔ گنگا کے گھاٹ سنسان ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اکثر پر وہاں پجاری بھی اس سونے پن کے

باعث گنگا آنا قریب قریب ترک کر دیتے ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر تو خاص طور پر خوب گھما گھمی رہتی ہے۔ اور ہماری آمدنی بھی نمایاں طور پر زیادہ ہو جاتی ہے دریا میں دیے اور پھول پتے نظر آنے لگتے ہیں۔ مندروں کی گھنٹیوں کی آوازیں گہری اور شوخ ہو جاتی ہیں۔ پورنماشی۔ اماوس، سورج اور چندر گرہن۔ جنم اشٹمی اور گنگا اشنان کے تہوار تو ہمارے لیے زندگی کا پیغام لاتے ہیں۔ کئی مرتبہ تو ہم لوگوں کے اچھے تیراک اور غوطہ خور ہونے کی وجہ سے یاتری اور پولیس والے بھی بلا لیتے ہیں اور ہم ندی کی تہہ میں کھوئی ہوئی چیزوں کی کھوج کرتے ہیں۔ ہمیں نہ صرف ہمیں اچھی مزدوری ہی مل جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو بہت انعام بھی ملتا ہے کچھ عرصہ ہوا ہم لوگوں کو ندی میں سے ایک کپڑے کی تھیلی ملی جس میں بہت سے زیور بند تھے۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے گاؤں سے چار پانچ میل پرے ایک گاؤں میں چوری ہوئی تھی چونکہ پولیس ان چوروں کے تعاقب میں تھی۔ ان چوروں کو زیور ندی میں پھینکنے کے سوا کچھ نہ بنی۔ جب ہمیں اس پوری کہانی کا پتہ چلا تو ہم نے گھیتو کو زیور دیکر اُس گاؤں میں بھیجا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ زیور ایک شادی والے گھر سے شادی کے ایک ہفتہ پہلے چرائے گئے تھے لڑکی کی شادی کا معاملہ تھا اور تمام گھر والے سخت پریشان تھے۔ زیور مل جانے پر تمام گھر والوں کے چہرے کھل اُٹھے اور انہوں نے گھیتو کی خوب خاطر تواضع کی اور رخصتی پر ہم سب کے لیے چالیس روپے بطور انعام بھیجے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ہمیں بہت سی قیمتی چیزیں ملتی ہیں جن کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ پھر تو ہم لوگوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔

ہم لوگ روز دوپہر کو گنگا نہانے جاتے ہیں۔ ہم لوگوں کا خاص مقام ریل کا پل ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ پل پر سے آتی جاتی گاڑیوں کی وجہ سے لکشمی کی ہمیشہ بارش ہوتی رہتی ہے۔ لوگ گاڑیوں میں روپے پیسے گنگا میں پھینکتے ہیں۔ گزرتی گاڑی کی گڑگڑاہٹ میں یہ سکّے آہنی پُل سے ٹکراتے نیچے پانی میں نہایت دلکش دائرے بناتے ہوئے گنگا میا کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ اور پھر ہم لوگ پانی میں غوطہ لگا کر ہاتھ پاؤں سے ٹٹول کر ان سکّوں کو نکال کر ہی دم لیتے ہیں اور پھر آخر یہ مایا گنگا میا کے کس کام کی ہے۔ وہ اسی طرح اپنے بیٹوں کو روزی دیتی ہے۔

ہم گنگا ندی میں داخل ہونے سے پہلے کنارے پر کپڑے اُتار کر سورج کو نمسکار کرتے ہیں اور پھر گنگا میّا سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ ہماری دن کی روزی میں برکت دے۔ اس کے بعد ہم لوگ پانی میں داخل ہو کر اپنی کھوج شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں ان سکّوں کو بہت جلد بھانپ لیتے ہیں۔ ہمیں زیادہ تر پیسوں کی تعداد ہی ملتی ہے اور اس سے کم دھیلے اور اکنیوں کی۔ کبھی کبھی تو خوش قسمتی سے روپیہ تک بھی ہاتھ لگ جاتا ہے۔ جب تک ہم پانی میں رہتے ہیں یہ سکّے منہ میں ڈالتے رہتے ہیں۔ پانی سے باہر آنے پر ہم اپنا اپنا مال اپنے اپنے کرتوں میں ڈال دیتے ہیں۔

ہم سب لوگوں کا ایک دوسرے سے کوئی راز نہیں کیونکہ ہم سب کی نیّت صاف ہے۔ لیکن اُس دن مجھے دُلارا کو دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ مجھے اُس روز پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک مختلف راستے پر جا رہا تھا —— ہم سب سے الگ اور یہ سب کچھ ہمارے ہوتے ہوئے۔

پچھلے دو تین مہینوں سے دُلارے کا "مال" ہم سب سے بھاری ہوتا۔ شاید اُسکی قسمت کا ستارہ تیز تھا۔ اُس کے مال میں نہ صرف سکّے ہی زیادہ ہوتے بلکہ کبھی کبھار کوئی نہ کوئی زیور بھی شامل ہوتا ہمیں اُس کی قسمت پر رشک آتا لیکن دلارا ہم سب سے اچھا غوطہ خور اور تیراک بھی تو تھا اور تمہاری دادا نے تو اپنے تمام خاص گرُ اُسے سکھا دیے تھے۔

پرسوں کی بات ہے — نہیں آج اسے چوتھا روز ہے۔ میں پانی کے اندر تھا اور اپنے پاؤں سے کنارے کے قریب ہی "مال" ٹٹول رہا تھا۔ مجھے پانی میں تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تھا اور میرا منھ سکوں سے بھر گیا تھا۔ میں کچھ تھک سا گیا تھا اور مجھے اپنے جسم میں کچھ اینٹھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں پانی سے باہر آرہا تھا کہ عین اُسوقت دُلارا پانی میں کودا اگرچہ میں نے دلارے کو نہیں دیکھا تھا لیکن ہم لوگوں کو ایک دوسرے کے کودنے کے انداز سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔

میں نے دلارے کو آواز دی۔

"کیوں بھئی۔ صبح سے دکھائی نہیں دیے؟"

"بس ابھی گھر سے ہی سیدھا چلا آرہا ہوں" اُس نے پانی میں سے سر نکال کر اپنے لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوے کہا۔

"اور کھیتو اور جگو کہاں ہیں؟" مجھے کھیتو کا نام لیتے وقت نہ جانے کیوں ہنسی آجاتی۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک کھیت میں پیدا ہوا تھا اور اس کا نام اسی لیے کھیتو رکھ دیا گیا تھا۔

"کھیتو اور جگو آج اُدھر آٹھویں "مورچے" پر ہیں۔"

دُلارے کی "مورچے" سے مراد ریل کی پُل کے ستونوں سے تھی۔

"آج تو ادھر خوب کمائی ہے" دلارے نے ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بُرا تو اِدھر بھی نہیں ہے۔ میں نے صبح سے تین روپے بنا لیے ہیں" اور پھر میں پانی سے نکل کر ریت پر جا بیٹھا۔ ریت کی گرم اور سورج کی خوشگوار تپش پانی میں رہنے کے بعد جسم کو نہایت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اور آج تو ہوا بھی نہیں چل رہی تھی ورنہ سارا جسم کپکپانے لگتا ہے۔

"کل میلہ ہے۔ چلو گے نا" دلارے نے اپنے جسم پر پانی اچھالتے ہوئے کہا۔

"بھلا گنگا اشنان کے میلے میں نہیں جائیں گے!" میں نے اُسے جواب دیا میں نے اپنے پیسے ایک کپڑے میں باندھ کر کُرتے میں ڈال دیے۔

"بھئی اِس جگہ پر تو تم نے خوب اچھا جھاڑ دیا ہے" دلارے نے پانی میں سے کہا: "بھئی میں تو آگے چلا" یہ کہہ کر دُلارا تیسرے اور چوتھے "مورچے" کی طرف چلا گیا۔

میں نے اپنے پاؤں سستانے کے لیے لمبے کیے اور ایک کہنی کی ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔ ریت کی گرمائش اسقدر خوشگوار معلوم ہو رہی تھی جیسے مرغی کے پروں کے نیچے چوزوں کو معلوم ہوتی ہوگی۔ میں نے کرتا اُٹھا کر سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ عرصے بعد میری آنکھ کھلی۔ وہی خوشگوار ریت اب جسم کو جلانے لگی تھی۔ میں نے ندی کی طرف نگاہ ڈالی جگو اور کھیتو اب بالکل نظر نہیں آرہے تھے صرف اُن کے کپڑے آٹھویں "مورچے" کے قریب دکھائی دے رہے تھے اور

دُلارا ابھی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایکا ایک پُل پر سے ایک گاڑی گزری اور گڑگڑاہٹ میں کچھ سکّے کھنکھناتے ہوئے پانی میں جا گرے۔ دو ایک سکّے میرے قریب ہی پانی میں گرے اور گرتے ہوئے پھیلتی ہوئی لہروں کے نشان چھوڑ گئے۔ میں پانی میں کود گیا اور پاؤں سے انہیں ٹٹولنے لگا۔ اچانک مجھے آٹھویں "موریچے" کے پاس جگو اور کھیتو کے کپڑے ملتے ہوئے معلوم ہوئے۔ میں لپک کر پانی سے باہر آ گیا۔ لیکن کپڑے مجھے اپنی جگہ پر ہی پڑے ہوئے دکھائی دیے۔ میں اطمینان سے پھر اُن سکوں کی تلاش میں لگ گیا۔ چند لمحوں کے بعد جب میں یہ سکّے تلاش کر چکا تو میں آگے بڑھا۔ پل کے پہلے چار ستونوں میں سے تو ندی بہہ رہی تھی لیکن پانچواں اور چھٹا سوکھا تھا۔ پھر ساتویں سے گیارھویں تک ندی بہہ رہی تھی۔ گیارھویں ستون کے پاس تو ندی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ اور اسی لیے ہم لوگ وہاں تک نہیں جاتے تھے۔ اچانک مجھے گیارھویں ستون کے پاس دلارے کا بالوں بھرا سر نظر آیا۔ میں چھٹے ستون کے پاس ریت کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دلارا پانی کے اندر غوطہ پر غوطہ لگا رہا تھا۔ جیسے وہ کسی وزنی چیز کو پکڑنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ پھر جو کچھ میں نے دیکھا اُس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

دُلارا ایک لاش کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے اُسے پانی کی سطح پر لایا اور پھر اُس نے جلدی سے کوئی چیز اُس کے بدن سے الگ کر لی اور پھر جیسے ایک لمحہ میں اُس نے اُس لاش کو چھوڑ دیا ہو۔ دو ہی منٹ بعد وہ نہایت اطمینان سے نویں ستون کے پاس تیر رہا تھا۔ گیارھویں ستون کے پاس پانی حسبِ معمول دیوار سے ٹکراتا، لہریں بناتا پل کی دوسری طرف تیزی سے بہہ رہا تھا۔

شام کو جب ہم لوگ گاؤں کے لیے روانہ ہوئے تو دلارے کے "مال" میں ایک سونے کا کنگن تھا۔ جگو کو سارے دن میں پونے آٹھ آنے کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ کھیتو نے دُو روپے ساڑھے چار آنے اور میرے پاس تین روپے پونے بارہ آنے تھے لیکن دُلارے کے پاس دو روپے دس آنے اور ایک سونے کا کنگن تھا

"میری سمجھ میں نہیں آتا" کھیتو کہہ رہا تھا، "دن بھر تو میں پیسے نکالتا رہا لیکن یہ سب پونے آٹھ آنے ہی ہوئے؟ جگو کہیں میں نے اپنا "مال" تمہارے کرتے میں تو نہیں رکھ دیا!"

"بھئی دیکھ لو۔ تم یہ بھی لے سکتے ہو؟ یہ بھی تو تمہارے ہی ہیں!"

اور دلارا ہم تینوں سے ذرا دوری پر نہایت اطمینان سے —— "کاسے لاگی نجریا" گاتا جا رہا تھا!

اگلے روز گنگا اشنان کا میلہ تھا۔ دُلارا اور میں دونوں اکٹھے میلہ دیکھنے کیلئے گھاٹ کی طرف چل دیے۔ میلے میں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہی بیل گاڑی۔ موٹریں اور بسوں کی لمبی قطاریں۔ معمول کی طرح پیدل لوگوں کی بھیڑ، بینڈ باجے، کھیل کود کے سامان، رنگ برنگ کاغذ اور مٹی کے کھلونے والوں کی دُکانیں، وہی ہر سال کی طرح وہی بڑے اور چاٹ والے اور حلوائی، وہی پانڈے لوگ جو اپنے ججمانوں سے پکڑا دھکڑی کر رہے تھے اور انہیں "نچوڑنے" کی مکمل کوششیں! وہی مندروں کے گھنٹے اور گھڑیالوں کی آوازیں، اور وہی یاتریوں کا بے پناہ ہجوم جو گھاٹ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا بھیڑ کو چیرتے ہوئے ایک پانڈے جی مہاراج ہماری طرف بڑھے اُن کے

ساتھ ایک سیوا سمتی کا والنٹیر بھی تھا۔

"اچھا ہوا۔ دلارے اور راگھو تم یہیں مل گئے۔ ہم تمہیں ڈھونڈتے تھے بیٹا" پانڈے جی نے ہمیں شانوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ پیشتر کہ ہم کچھ سوال کرسکتے وہ ہم دونوں کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔

پانڈے جی نے ایک جمبان گی سیٹھانی کی ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی پانی میں بہہ گئی تھی اور وہ بیچاری رو رو کر آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے تھیں۔

"ہائے اب کیا ہوگا۔ اب میں سیٹھ جی سے کیا کہونگی؟ وہ تو مجھے پہلے ہی میلہ میں آنے سے روک رہے تھے" سیٹھانی بے تحاشا روئے چلے جا رہی تھیں۔

"سیٹھانی جی۔ اب آپ کوئی چنتا نہ کیجئے۔ خوش قسمتی سے یہ لڑکے یہیں مل گئے اگر آپ کی انگوٹھی پانی میں گری ہے تو یہ لڑکے ندی کا کلیجہ چیر کر بھی نکال لائیں گے اور ہاں اگر کسی نے اُٹھا لی ہے تو دوسری بات ہے" پانڈے جی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور پھر وہ ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"شاباش لڑکو! گھس جاؤ پانی میں دیکھتے کیا ہو! اگر انگوٹھی ڈھونڈھ لائے تو سیٹھانی جی بہت انعام دیں گی"!

"ہاں۔ ہاں" سیٹھانی جی ہڑبڑا کر بولیں "نیم جی میرا پرس تو لاؤ میں پورے پچاس —— نہیں سو روپے انعام دونگی۔ ارے انگوٹھی بڑی قیمتی تھی۔ میری شادی کی انگوٹھی تھی۔ سیٹھ جی خود کلکتے سے دو ہزار میں بنوا کر لائے تھے" اور سیٹھانی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

سَو روپے کا نام سُن کر دلارے اور میں نے فوراً کپڑے اُتار دیئے اور پانی میں اُتر گئے

"یہ انگوٹھی کہاں گری تھی" میں نے سیٹھانی جی سے پوچھا۔

"ارے یہیں گھاٹ کے پاس۔ نہیں۔ ہیں ادھر آگے بھی گئی تھی۔ اور ادھر بھی" سیٹھانی جی لاکھ کوشش کرنے پر بھی ٹھیک جگہ نہ بتا پائیں۔

ہم لوگوں نے اپنی کھوج شروع کر دی۔ گھاٹ کی سیڑھیوں سے پرے پانی صرف کمر تک تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے پاؤں سے ٹٹولنا شروع کر دیا کچھ ہی منٹوں میں ہمنے دس پندرہ ہاتھ اِدھر اُدھر کھوج ڈالا۔

سیٹھانی ہر دو تین منٹ کے بعد ہم سے پوچھتیں "کیوں انگوٹھی ملی"؟ اور جب ہم کہتے "ابھی نہیں" تو وہ کہنے لگ جاتیں "ہائے رام اب کیا ہوگا؟ میں یہ انگوٹھی پہن کر ہی کیوں آئی۔ سیٹھ جی کیا کہیں گے؟ کیا سمجھیں گے؟ وہ بیچارے مجھ پر شک کرنے لگ جائیں گے!!

پتلا دبلا بڈھا منیم جس کے تمام دانت جھڑ چکے تھے اور جو بات کرتے وقت نہایت پوپلا سا منہ بناتا سیٹھانی کی باتیں سن کر سیڑھیوں تک اتر آتا اور ہم سے جلدی ڈھونڈنے کے لیے کہتا۔

"ارے سیٹھ جی بیحد خفا ہونگے۔ انہیں ٹھیک ایک بجے موٹر واپس ہاؤس میں چاہیئے۔ بھئی ایشور کے لیے جلدی کرو" اور اُسکی نگاہیں پھر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر جا پڑتیں۔

ہم بدستور کھوج میں مشغول تھے۔ اب ہم دونوں نے گہرے پانی میں غوطے لگا کر کھوج کرنی شروع کر دی۔ سیٹھانی کا ٹھیک جگہ نہ بتلا سکنے پر ہم لوگوں کے لیے اور مشکل تھی۔ ہم گھاٹ کے عین سامنے سے شروع ہوئے

دلارا نے بہاؤ کی طرف کھوج کرنی شروع کی اور میں نے بہاؤ کے خلاف ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ غوطہ لگاتے اور تقریباً ایک ساتھ ہی سطح پانی پر آئے ایک بار میرے پاؤں میں کانٹے چبھنے کی وجہ سے مجھے یکدم اوپر آنا پڑا۔ میں نے دیکھا دلارے کا سر بھی پانی سے باہر نکلا ہوا تھا اور پھر مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اُسکے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے وہ پاؤں میں پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دلارے نے مجھے پانی کے اوپر آتے دیکھ کر شراپ سے ایک غوطہ لگایا۔ اور تیزی سے پانی کی سطح کے نیچے گم ہو گیا۔ میں پھر کچھ عرصے تک پانی کے نیچے انگوٹھی کو تلاش کرتا رہا اور پھر ایکا ایک گھاٹ پر سے ایک شور سا بلند ہوا۔ اور میں دیکھنے کے لیے اوپر آنے لگا۔

"ارے وہ غوطہ خور لڑکا کہاں گیا؟ منیم جی اپنے پوپلے منہ سے چلّا رہے تھے "پورے پانچ منٹ سے وہ اوپر نہیں آیا!"

میں فوراً سطح پانی پر آ گیا۔ لیکن یہ میری بابت نہیں بلکہ دلارے کی بابت کہا جا رہا تھا۔

"بہہ گیا"

"ارے بیچارے کو ڈھونڈھو"

"بیچارہ یہیں تو غوطے لگا رہا تھا؟ چچ چچ! گنگا میا نے آج کے روز ضرور ایک بلی لینی تھی!"

میں فوراً تیر کر اُس جگہ پہنچا جہاں دُلارا غوطے لگا رہا تھا۔ لیکن وہ میری اِدھر اُدھر تلاش کرنے پر بھی نہ مل سکا۔ دور تک پانی کی سطح پر کسی قسم کا کوئی

نشان وعلامت نہ تھی جس سے دلارا کے ڈوبنے کا پتہ چل سکے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا گنگا میّا دلارے کو نگل گئی ہو۔

آج پورے ۴۲ گھنٹے بعد ہمارے گاؤں میں میل ڈیڑھ پرے دلارے کی لاش باندھ کے پاس ملی ہے۔ گاؤں والے اُسے اُٹھا کر لائے ہیں۔ اُسکی پاؤں کی اُنگلی میں وہی سیٹھانی کی چمکتی ہوئی بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ گاؤں والے اور دُلارے کے ماں باپ اُس سیٹھانی کو کوستے ہیں جس کی انگوٹھی کو کھو جنے کے لیے دُلارے کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ انگوٹھی ڈھونڈھ کر ایک ایسے بھنور میں پھنس گیا جو اُسے ندی کے نیچے موت کے منہ تک لے گیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اُس کی روح جھوٹ، پاپ اور لالچ کے ایسے بھنور میں پھنس گئی تھی جس سے گنگا میّا نے اُسے نجات دلائی۔

کٹی پتنگ

برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے رائے صاحب کر پارام کے جھریاں آلود چہرے پر حرکت کے آثار نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی سفید مونچھوں کی جنبش سے بائیں گال پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اخبار بند کر دیا۔ چوڑی ابھری ہوئی پیشانی اور گھنے ابروؤں کے نیچے چھپی ہوئی آنکھوں پر سے چشمہ اتارتے ہوئے اخبار بند کر دیا پر ایک پُر اطمینان مسکراہٹ پھیل گئی ایک خبر چودھری مختار سنگھ کو پولیس میڈل ملنے کی تھی اور دوسری خبر چونی لال کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوجانے کی۔ وہی چونی لال جو کسی زمانے میں سیالکوٹ میں انکے ماتحت سب انسپکٹر تھا۔ جب وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ بٹوارے کے دس بارہ سال کے اندر ہی آج وہ گڑگاؤں میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ انہوں نے ابھی ابھی یہ خبر اخبار کے تقرریوں اور تبادلے کے کالموں میں پڑھی تھی۔

وہ کسی غیر اختیاری جذبے کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ جوڑوں کے درد نے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔ رائے صاحب کے بارعب چہرے پر درد و کرب کے آثار نمودار ہوئے لیکن وہ زیادہ پروانہ کرتے ہوئے کمرے کے اندر چلے گئے اندر پہنچ کر وہ اپنی لکھنے والی میز پر بیٹھ گئے۔ دراز میں سے دس نئے پیسے والا انتر دیشیہ پتر (INLAND LETTER) نکالا لیکن پھر کچھ سوچ کر

پیڈ پر خط لکھنے کو ترجیح دی۔ وہ دو منٹ تک سوچتے رہے کہ خط کیسے شروع کیا جائے۔ اُن کے ذہن میں کئی جملے آئے:"مائی ڈیر چونی لال!" آخر چونی لال اُنکا ماتحت ہی تو رہا تھا لیکن رائے صاحب خود بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ریٹائر ہوئے تھے اور چونی لال آج سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔"دیوان چونی لال صاحب!" لیکن یہ تو ایسے معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی افسر بالا کو لکھ رہے ہوں! تھوڑی دیر اور سوچنے کے بعد انہوں نے" مائی ڈیر دیوان چونی لال" لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسکے بعد کی تحریر لکھنے میں انہیں کچھ زیادہ دقت پیش نہ آئی۔

"مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی ہے کہ آپ بطور سپرنٹنڈنٹ پولیس گڑگاؤں آگئے ہیں۔ میں ریٹائر ہونے کے بعد دہلی میں مقیم ہوں۔ اُمید ہے کہ اب آپ کا دہلی اکثر آنا جانا رہیگا اور مجھے پچھلی یادوں کو جو کہ آپ سے وابستہ ہیں پھر سے تازہ کرنے کا موقع ملیگا!" وغیرہ وغیرہ۔

ایسے خطوط لکھنا رائے صاحب کے لیے معمول ہوگیا تھا۔ وہ اخبار میں کبھی کبھار چھپنے والے ترقیاتی، تعنیاتی اور تبادلوں کے کالموں کو نہایت غور سے پڑھتے اور ہر جاننے والے کو اسی طرح خط لکھتے۔ اُنہیں یہ خط لکھنے میں بڑی مسرت ملتی گویا وہ ابھی تک اپنے ڈیپارٹمنٹ کی کوئی اہم کڑی ہوں۔ اکثر انہیں جواب بھی موصول ہوتے ہر ایسا جواب ملنے پر اُنہیں بہت تسکین ملتی اور وہ اپنی صبح کی سیر کے چند ساتھیوں سے کئی دنوں تک اُس افسر کے نیک سیرت اور بلند کردار ہونے کا چرچا کرتے رہتے۔ ان میں سے اکثر جواب محض رسمی ہوتے جن میں اُن کے خلوص کی بے پناہ تعریف ہوتی۔ لیکن شاذونادر ہی کوئی اُن سے

ذاتی طور پر آکر ملنے کی تکلیف گوارا کرتا۔ لیکن جب کبھی کوئی افسر اُن کے خط کا جواب نہ دیتا تو اُنہیں اپنے کٹی پتنگ ہونے کا بڑا کربناک احساس ہوتا!

کیا زمانہ تھا جب رائے صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے، اُن دنوں گریڈ بھی اچھے تھے اور افسری واقعی افسری کہلائے جانے کی مستحق تھی۔ آٹھ کمروں کی کوٹھی میں ہمیشہ دو چار نوکروں کے علاوہ درجنوں سپاہی انکے اشارے کے منتظر رہتے کیا رُعب تھا! کیا دبدبہ تھا! رائے صاحب کی گرجدار آواز اور رعب سے سارا حلقہ کانپتا۔ چوڑا چکلا سینہ، بھرا ہوا صحتمند چہرہ جس پر لمبی لمبی سیاہ چمکیلی مونچھوں کی نوکیں رسّی کی طرح بٹی رہتیں۔ اور وہ بڑی شان سے اُن مونچھوں کو بات بات پر سہلایا کرتے! اُنکی مردانہ چال میں ایک عجیب بانکپن تھا! بٹی ہوئی مونچھیں آج بھی تھیں لیکن کمزور، سفید! شاید اِن مونچھوں کی بنا پر ہی وہ برسوں کے مریض معلوم ہوتے۔ چال میں آج بھی جلال تھا لیکن دبا ہوا، سسکتا ہوا۔ گویا عمارت گر گئی ہو اور عالیشان کھنڈر باقی رہ گئے ہوں۔ کوٹھی آج بھی تھی لیکن صرف برآمدہ اور دو عدد کمروں پر مشتمل! آواز میں گرج آج بھی تھی لیکن اُس میں سینکڑوں گردنوں کو جھکانے کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ سات آٹھ سو ماہوار تنخواہ کی بجائے اِن گرانی کے دنوں میں اڑھائی سو روپے کی پنشن رہ گئی تھی! اور پھر اڑھائی سو کی تنخواہ میں نوکر چاکر کا دخل ہی کہاں ہو سکتا تھا! اب گورنمنٹ کو کون سمجھائے کہ مہنگائی کے اِن دنوں میں پنشنیں بھی بھتہ گرانی کی مستحق ہیں!

رائے صاحب دیوان چونی لال کو لکھے ہوئے خط کو دوبارہ پڑھ کر ٹکٹ لگے لفافے میں ڈالنے ہی والے تھے کہ کھانسی کے دورے نے آگھیرا۔ آنکھوں اُبھوں!

آکھوں کھوں! کھانسی بڑھتی ہی گئی اور وہ کھانستے کھانستے بیدم ہو گئے۔

دوسرے کمرے میں سے آشا نے بھاگ کر انہیں سنبھالا۔ فوراً دوائی کی ایک خوراک دی۔ تھوڑی دیر بعد طبیعت سنبھلی تو انہوں نے آشا کو نہایت پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُسکے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"آشا بیٹی! تمہارے لیے ہی تو جی رہا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو جلد ہی تمہارے ہاتھ پیلے کر دونگا! مدن اور ہتیش تو کمبخت پیدا ہونے سے پہلے ہی مرجاتے تو اچھا تھا!

"ایسا نہ کہیئے پتاجی!"

"اور کیا! سوچا تھا بڑھاپا ان لڑکوں کے سہارے کٹ جائیگا۔ ایک بیٹھ گیا سات سمندر دور اور دوسرا کمبخت کتّے کی اولاد۔۔۔!"

رائے صاحب کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا۔ قریب تھا کہ کھانسی کا دورہ پھر سے شروع ہو جائے آشا نے لپک کر اُنہیں پانی کا گھونٹ پلایا۔

"آئیے آپ بستر پر لیٹ جائیے۔ میں ابھی ماں کو پڑوس سے بلائے لاتی ہوں!"

وہ رائے صاحب کو کھینچکر پلنگ تک لے گئی اور پھر جلدی سے ماں کو بلانے کے لیے چلی گئی۔

رائے صاحب کو اپنے لڑکوں کے خلاف سخت غصہ تھا۔ بڑا لڑکا مدن تو کنیڈا جا کر وہاں کا ہی ہو رہا۔ اُس نے وہیں شادی کر کے وہیں کے حقوق شہریت بھی حاصل کر لیے تھے۔ باپ نے بڑے چاؤ سے لکھایا پڑھایا، عمدہ تعلیم کے لیے باہر بھیجا اور پھر لڑکا ہی گنوا دیا۔ چھوٹا لڑکا صحیح معنوں میں پولیس والوں کی اولاد ثابت ہوا۔ پڑھ لکھ کر بولا بزنس کرونگا۔ نہ جانے کیا کہہ پھسلا کے رائےصاحب سے پراویڈنٹ فنڈ کی بیشتر رقم حاصل کر کے بزنس کے لیے بمبئی چلا گیا۔ بھلا بمبئی کی آب و ہوا اور روپے پیسے کا

جوانی کی عمر میں کیا میل۔ اُس نے تمام رقم عیش میں گنوا دی۔ رائے صاحب کا اثاثہ اب قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ گھر میں جوان لڑکی اور سر پر بڑھاپا، غصے میں آ کر لڑکے کو گھر سے ہی نکالدیا۔ دہلی کے کرایوں اور گرانی کو دیکھتے ہوئے ایک نو آباد کالونی میں دو سو گز کا پلاٹ خرید کر مکان بنوالیا۔ کہاں رہائش کشادہ کوٹھیوں کی، کہاں دو کمرے کا مکان۔ پینشن تو ناکافی تھی ہی سوچا تھا کہ دو کمرے اور ڈال کر کرایہ کی آمدنی کا ذریعہ کیا جائے لیکن بیوی نے کہا پھر لڑکی کی شادی کیونکر ہوگی۔ یہی سوچکر کرایہ کی اسکیم ملتوی کر دی گئی۔

آشا کو ایف۔ اے کیے چار سال ہو گئے تھے اور اب وہ اپنے سانولے سلونے دولھا کا انتظار کر رہی تھی جو اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائیگا لیکن دولھے کیا سڑک پر دھرے ہیں۔ اور پھر آشا کونسی حور پری تھی کہ کوئی اچھا جہیز لیے بنا اپنا ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ درست تھا کہ وہ اچھی پڑھی لکھی تھی! باسلیقہ اور ہوشیار تھی، گھر اور رسوئی سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن نقوش معمولی تھے اور رنگت پکی ہوئی۔ اس پر باپ کے قد و جسامت سے غیر متوقع قد بہت چھوٹا تھا جو کہ شاید ماں سے اُسے ورثہ میں ملا تھا۔ کئی جگہ بات چیت چلی لیکن پکا ہوا گندمی رنگ اور چھوٹا قد ہمیشہ سدِ راہ رہا۔ ماں باپ ان دونوں چیزوں کے بارے میں کر بھی کیا سکتے تھے۔ صرف ایک چیز تھی جو ان نقائص پر پردہ ڈال سکتی تھی اور وہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تھا ایک اچھا سا جہیز!

رائے صاحب اور انکی بیوی چندر کھی اس امر سے بخوبی واقف تھے بشروع شروع میں تو رائے صاحب نے سوچا تھا کہ وہ کسی نوجوان سپرنٹنڈنٹ کو اپنا داماد

بنا سکیں گے لیکن وہ لڑکی کو دیکھتے ہی صاف کنی کاٹ گئے۔ پھر خیال آیا کہ وہ کسی ماتحت انسپکٹر کو افسرانہ دباؤ یا کسی دوست کے لڑکے کو اپنی رائے صاحبی کے خطاب سے متاثر کر سکیں گے لیکن وہ زمانہ بھی نکل گیا۔ اب تو وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ آخر کسی نے ڈھلتے سورج کو بھی کبھی نمسکار کرتے دیکھا ہے۔!

"تو کہاں گئی تھی چندر مکھی؟ اور آشی تمہارے ساتھ نہیں آئی؟" رائے صاحب چندر مکھی کو دیکھ کر آہستہ سے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چندر مکھی نے آنگن میں سے چوکی گھسیٹ کر پلنگ کے قریب لا ڈالی۔ اسکے چہرے بے رونق چہرے پر اطمینان کی قوسیں ابھر رہی تھیں گویا اس نے کوئی بہت بڑا کام کر ڈالا ہو۔ وہ اپنے کھچڑی بالوں کو دوپٹے کے پلو سے ڈھانپتے ہوئے قریب ہی چوکی پر بیٹھ گئی۔ "آشی راستے میں اپنی سہیلی کے پاس رک گئی ہے" اور پھر اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی آشی کے لیے ہی تو گئی تھی رام پیاری کے ہاں۔ وہ حصار والے آئے تھے نا اسے دیکھنے؟ میں نے سوچا رام پیاری سے اسکے بارے میں پتہ کر آؤں"

"تو کیا انہیں رشتہ منظور ہے؟" رائے صاحب نے چندر مکھی کے مطمئن چہرے کو پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"رام پیاری نے کہا ہے کہ وہ کسی طرح لڑکے کو منا ہی لیں گے اور پھر باتوں ہی باتوں میں کہا۔ رائے صاحب کی لڑکی ہے جہیز تو اچھا ہو گا ہی رائے صاحب کوئی دو کپڑوں میں اسے تھوڑا ہی بیاہ دینگے! اب بھلا میں کیا جواب دیتی" رائے صاحب کی نگاہیں جھک کر زمین کو گھورنے لگیں۔

"میں نے کہا ماں باپ تو ہمیشہ لڑکی کیلیے اپنی حیثیت سے بڑھکر ہی کرتے ہیں میں کوئی دودھ پیتی بچی تو تھی نہیں جو اُس کا یہ اشارا نہ سمجھتی۔ میں نے اسی لیے بات کو آگے نہیں بڑھایا کیونکہ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا"

"ہاں نہیں ہو سکتا! نہیں ہو سکتا!" رائےصاحب انتہائی حسرت سے زیر لب بڑبڑائے۔

"میں آتی بار ساوتری کے ہاں ہوتی آئی ہوں۔ میں نے اُس سے کہہ دیا ہے کہ ہمیں اُسکے دیور کا رشتہ منظور ہے"

"رام سرن سے! جانتی ہو اُسکی عمر کتنی ہے؟ چالیس برس اور پھر پہلی بیوی سے تین بچے بھی تو ہیں! رشتہ منظور کرنے سے پہلے پوچھ ہی لیا ہوتا"

"جانتی ہوں اچھی طرح سے جانتی ہوں" چندرمکھی بپھر کر بولی "بٹھائے رکھو گھر میں اپنی لاڈلی کو، جب تک وہ کسی کے...... ساتھ خود نکل نہ جائے! ایسی ہی بات تھی تو دس پندرہ ہزار پیدا کر لیے ہوتے کہیں سے! میں جو کچھ کرتی ہوں ہمیشہ غلط ہی کرتی ہوں!" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رائےصاحب اس طنز کی تاب نہ لا سکے۔ اُنکی نگاہیں زمین پر گر گئیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے "چندرمکھی، تمنے جو کچھ کیا شاید ٹھیک ہی کیا!" رائےصاحب کی آواز بیحد کمزور تھی گویا اُنکی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی ہو "میں زندگی کی دوڑ میں بہت تھک گیا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں!"

وہ دیر تک دیوار کی سفیدی میں کچھ ڈھونڈھتے رہے۔ اُنکی آنکھوں کی نمی میں زندگی کی تمام حسرتیں اور مجبوریاں سمٹ کر آ گئیں۔ اُنکے ہونٹ دیر تک خالی فضا میں کپکپاتے رہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اُٹھ کر لکھنے والی میز تک گئے اور اُس میں سے پیڈ نکال کر خط لکھنے لگے۔

مائی ڈیر چودھری مختار سنگھ!

آج اخبار میں آپکو بہادری کا مڈل ملنے کی خوشخبری پڑھکر طبیعت باغ باغ ہو اُٹھی......"

فاختہ اور ڈیکوٹا

میں کھانا ختم کر چکا تھا اور بیرا میز پر سے خالی پلیٹیں سنبھال رہا تھا میں نے کرسی پیچھے سرکاتے ہوئے سگرٹ نکالا اور اُسے سلگا کر نہایت اطمینان سے گہرے کش لینے لگا۔ باہر بیحد گرمی تھی لیکن لوٹس ریسٹورنٹ کے موٹی چقوں سے ڈھکے ہوئے دروازوں کے اندر ایک نہایت راحت بخش ٹھنڈک تھی۔ ہوا میں خس کی مہک تیر رہی تھی۔ جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے واپس دفتر جانا تھا جہاں کہ ہیڈ کلرک کی کرسی اور فائلوں سے لدا ہوا انبار میرا منتظر تھا۔ میں اُٹھنے ہی لگا تھا کہ پسینہ سے تر بتر خلیل ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔

"اوہ کمبخت برا ہو اس سروس کا! پورے تین گھنٹے لیٹ!" اُس نے اپنی سنبر فیلٹ قریب کی میز پر لڑھکاتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا خلیل سیدھا ہوائی اڈے سے چلا آرہا تھا جہاں وہ سروس میکنک تھا۔ بوسکی کی قمیص پسینے سے اُسکے جسم کے ساتھ چپک رہی تھی اور وہ اپنی پیشانی پسینہ سے تر رومال سے پونچھ رہا تھا۔

"الوؤں کی نوکری ہے الوؤں کی، کبھی رات کو دو بجے سروس آرہی ہے اور کبھی دن کے بارہ بجے! تم اچھے ہو یار!"

"ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ ہفتے میں تین بار مجموعی طور پر صرف چھ گھنٹے تمہیں تکلیف کرنی پڑتی ہے نا۔ یہاں روزانہ چھ بلکہ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینی پڑتی ہے"
میں اُٹھ کھڑا ہوا خلیل مُسکرا دیا۔

"لانا یار سگرٹ!" میں نے سگرٹ کیس اُسکی طرف بڑھا دیا۔ خلیل کا کبھی کبھار سگرٹ مانگ لینا کوئی خاص عجب بات بھی نہ تھی لیکن یہ چند موقعوں پر نہایت معنی خیز ہوتا۔ اس کا احساس مجھے چند اگلے لمحوں میں ہوا۔ سگرٹ کی حاجت اور خصوصاً مانگ کر پینے کی عادت خلیل میں اُسوقت نمایاں ہوتی جبکہ اُس کا ہاتھ تنگ ہوتا۔

"ارے یار جا رہے ہو گیا؟" اُس نے اپنی بڑی بڑی معصوم شرارت بھری آنکھوں سے جھانکتے ہوے کہا۔

"ہاں بھئی دفتر میں کام بہت زیادہ ہے اور تمہاری قسم کی نوکریاں بہت کم!
"ذرا سنو" اور وہ میرے بہت قریب آگیا اور نہایت دھیمے لہجے میں کہنے لگا
"ابے یار وہ تنخواہ آنے میں پھر دیر ہو گئی ہے۔ ذرا دس کا نوٹ تو دیدینا" اُس نے اپنی کھردری بڑھی ہوئی ڈاڑھی کو کھجلاتے ہوے کہا۔ خلیل کی ڈاڑھی میں یہ ایک عجب وصف تھا کہ باوجود دن میں دو بار شیو کرنے کے وہ پھر شیطان کی طرح آموجود ہوتی۔

"خلیل۔ اسوقت تو میرے پاس پیسے نہیں۔ اُمانا تھ آئیگا اُس سے مانگ لینا!
"اچھا پارٹنر۔ فکر نہ کرو!"

ہم واقعی سچ مچ پارٹنر تھے۔ میں نے اُن دنوں ایک چھوٹا سا مکان لال باغ میں لے رکھا تھا جسے ہم نے نہایت پیار سے "بیچلرز لاج" کا نام

دبے رکھا تھا۔ میرے علاوہ خلیل اور امانا تھ بھی اس مکان میں آباد تھے۔ امانا تھ سر سے فارغ البال اور پائپ کے بنا ادھورا تھا۔ وہ ایک گراموفون ریکارڈنگ کمپنی کا نمایندہ تھا جس کا کام نئے نئے آرٹسٹ ڈھونڈنا۔ اُن کا ٹسٹ لینا اور پھر ان کے لیے نت نئی غزلوں اور گیتوں کا انتخاب کرنا تھا۔ خلیل ہوائی اڈے پر ایک ایرویز کمپنی سے منسلک تھا۔ کمپنی کا دفتر کلکتہ میں تھا اور چونکہ ہوائی سروس لکھنؤ سے گزرتی تھی لہذا خلیل کی کمپنی کے نمایندہ و میکنک کی حیثیت سے تمام سروسوں پر اس کی ڈیوٹی تھی۔ لکھنؤ میں اکیلا ہونے کی وجہ سے اُس کی تنخواہ کلکتہ سے بھیجی جاتی اور اُس کا کبھی کبھار لیٹ ہو جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

مجھے اسوقت اپنی جیب میں پیسے نہ ہونے پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ دراصل خلیل نہایت معصومانہ طور پر اور نہایت پیار سے مانگتا تھا کہ آپ کبھی نہ نہ کر سکتے۔ وہ عادتاً تو زیادہ فضول خرچ نہ تھا لیکن اُسے اچھے اچھے کپڑے پہننے کا بیحد شوق تھا وہ اکثر بوسکی کی قمیص اور سر پر یا پھر کارڈرائے کی ہیٹ پہنے پھرتا رہتا۔ اُس کے لمبے لمبے بال اکثر بکھرے رہتے لیکن آپ انہیں پریشان نہ کہہ سکتے تھے۔ اُسکے کپڑے ایک عجیب لاپرواہی کے ساتھ اُسکے جسم سے چپکے رہتے، گردن اور سینے کے تقریباً آدھے بٹن کھلے رہتے جس میں سے اُسکی مصری روئی سے بنی ہوئی کریم نما بنیائن اور گنجان بالوں سے ڈھکا ہوا سینہ جھانکتا رہتا۔ اسکی بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب تھی جو کہ اُسکے پاک اور بناوٹ سے دور باطن کی ضامن تھی اُسکے چہرے پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ اکثر جب میں اُس کا تعارف دوستوں سے کراتا۔ "خلیل صاحب سے ملیے۔ یہ فاختہ ....." تو وہ ہمیشہ وضاحت

کے طور پر کہہ اٹھتا۔

"اجی وہ زمانہ گیا جبکہ خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔ آجکل تو ڈیکوٹا اُڑاتے ہیں!"

اُسکے بکھرے ہوئے بالوں پر اکثر ایک سبز رنگ کی فیلٹ ہوتی جس میں ایک خوبصورت سُرخ پَر ٹنکا رہتا۔ وہ ہمیشہ ایک ادا سے فیلٹ اتارتا اور کسی قریبی کرسی یا میز پر لڑھکا دیتا۔

خلیل میں سب سے بڑی خوبی تھی کہ جب کبھی وہ کسی سے اُدھار لیتا، اُسے نہایت باقاعدگی سے مقررہ وقت پر پُرتکلف شکریہ کے ساتھ واپس کر دیتا، کم سے کم میں نے اُسے آج تک وعدہ خلافی کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا اور وہ اس انکساری اور شکریہ سے لبریز الفاظ کے ساتھ کہ آپ اُسکے اخلاق کے گرویدہ ہو جاتے یہ شکریہ محض رسمی نہ ہوتا بلکہ اُس میں ایک کشش انگیز خلوص ہوتا۔ وہ آپکو یقین دلاتا کہ آپ کی برموقعہ امداد نے اُسکی اشد ضروری مشکلات کو حل کر دیا اور وہ اُس کا تہہ دل سے شکر گزار تھا۔ اُسکی ضروریات بھی حد درجہ کی انسانی ہوتیں اور وہ انہیں اسطرح پیش کرتا کہ آپ خواہ مخواہ اسکی مدد کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

"ارے خلیل تیری اس فیلٹ ہیٹ کو کیا ہوا ہے" اُمانا تھ ازراہ مذاق پوچھ بیٹھتا۔

"چاچا کیا بتاؤں" خلیل اُمانا تھ کو عمر اور فارغ البالی کی رعایت سے ہمیشہ چاچا کہہ کر مخاطب ہوتا "کل بس میں جا رہا تھا۔ کارلٹن ہوٹل سے ایک لڑکی بیٹھی۔ کیا بتاؤں چاچا" وہ اس طرح سے نئی نویلی دلہن کی طرح جھینپ جاتا کہ

ہنستے ہی بنتی۔

"سیاہ آبنوسی رنگ تھا۔ میری سائیکل کے رنگ سے بھی سیاہ!" خلیل نے ابھی ابھی اپنی سائیکل سپرے پینٹ کروائی تھی۔ لیکن چاچا پوڈر کی نہیں تھیں کہ ہر جھونکے کے ساتھ گر کر اِدھر اُدھر اُڑ جاتیں۔ میں بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا کہ وہ خراماں خراماں چلتی میرے پاس کی سیٹ میں دھنس گئی!"

"دِل کو دِل سے راہ ہو گی!" اُمانا تھ نے پھبتی کسی۔

"چاچا۔ اُسکے دِل کو بیچارے میرے نازک دِل سے کیا راہ ہو گی لیکن وہ قیامت کی بیٹی میرے اکلوتے فیلٹ ہیٹ پر قیامت ڈھاگئی۔ اور وہ نہایت یاس بھری نظروں سے اپنی فیلٹ ہیٹ کو دیکھنے لگا۔ فیلٹ ہیٹ کا سُرخ بد اُس نازک اندام بوجھ سے تیج گیا تھا!

"چاچا اب لڑکی کا کیا ہو گا؟ مجھے تو شام کو اُسے سینما لے جانا ہے اور میرے پاس تو دوسرا فیلٹ ہیٹ ہے نہیں!"

"تو کیا ہوا فیلٹ نہ سہی اور اگر لڑکی کو تم سے سچی محبت ہے تو فیلٹ ہی کیا بغیر قمیص کے بھی تمہیں دیکھ کر خوش ہو گی"

"ہاں چاچا۔ تم کوئی ایسا فیشن شروع کر دو نا!" یہ اُمانا تھ پر ایک ہلکی سی لیکن کاری چوٹ تھی۔ اُمانا تھ خود سمترا سے بہت بن ٹھن کر ملنے جایا کرتا تھا۔

"چاچا۔ چلا تو جاؤں لیکن یہ ذرا ایٹیکیٹ کے خلاف ہے۔ تو چاچا!"

"کیا ہے"۔

"تو چاچا تنخواہ تو ابھی ملی نہیں۔ فیلٹ ہیٹ لے لوں؟"

"اب جانے دے۔ یہ رہے بیس روپے!" اُمانا تھ کو کسی دوسرے کو ایسی حالت میں دیکھ کر بہت ترس آجاتا۔ خلیل اپنا ہاتھ جلدی سے پھیلا دیتا تاکہ اُمانا تھ کہیں اپنا ارادہ بدل نہ لے اور اسکی آنکھوں میں ایک شرارت بھری چمک کوند جاتی۔

"او تھینک یو انکل۔ یو آر گریٹ!" اور وہ کودتا پھاندتا کمرے سے باہر نکل جاتا۔

خلیل کی تمام مالی ضرورتوں کا تعلق عموماً لڑکی یا پھر اپنی ذات سے ہوتا اُسے لڑکی کے لیے تحفے خریدنے ہوتے، اُسے سینما کلب یا شاپنگ کے لیے لیجانا ہوتا یا پھر اپنے لیے ہی بش شرٹ، پینٹ، ہیٹ یا ٹائیاں خریدنا ہوتیں۔ اُمانا تھ ادر کسی حد تک میں بھی ایک کنوارے کے ناطے سے ان ضرورتوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اُمانا تھ کا سمترا کے ساتھ رومان بڑی تیزی سے مرحلے طے کر رہا تھا سمترا گراموفون کمپنی کی ایک نئی آرٹسٹ تھی اگرچہ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے بیحد جاذب نظر نہ تھی لیکن اُسکی آواز میں ایک عجب پُر کشش سوز تھا۔ وہ اکثر غزلیں گایا کرتی اور اُسکے دو تین نئے ریکارڈ مارکیٹ میں بہت پسند کیے جا رہے تھے۔ سمترا کی "دریافت" میں اُمانا تھ کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اُمانا تھ کو سنگیت سے گہری لگن تھی اور اسی لگن نے سمترا جیسی گمنام آرٹسٹ کو دُنیا سے روشناس کرایا۔ اس کے علاوہ اُسے لوک گیت اکٹھے کرنے کا بیحد شوق تھا۔ وہ حال ہی میں گڑھوال اور کمایوں کے دور دراز علاقوں میں سے جہاں کہ جدید تہذیب وہاں کے لوگوں کو چھو تک نہ گئی تھی۔ اپنی کمپنی کے لیے لوگ گیتوں کی انمول دھنیں ٹیپ ریکارڈ کر کے لایا تھا اور ان دھنوں کے ریکارڈوں کی لائبریری بنا کر مینشنل میوزیم اور

اور ملک کو بطور تحفہ دینا چاہتا تھا۔

اُمانا تھ ہر سچّے آرٹسٹ کی طرح فطری طور پر بیحد جذباتی تھا۔ اُس کا خلوص اُسے دوسروں کی ضرورتوں کا احساس کرنے پر مجبور کر دیتا اور وہ ہر کسی کی ہر ممکن مدد کرنے پر تیار ہو جاتا اور پھر خلیل کی معصوم صورت اُس کی انتہائی انسانی ضرورتیں گویا اُمانا تھ کے اندرونی خلا کو پُر کرنے میں مدد دیتی تھیں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

"چاچا!" خلیل نے بچوں کی طرح اس لفظ کو ادا کرتے ہوئے کہا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ وہ اپنی پائپ لگائے کسی دھیان میں ڈوبا ہوا ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ نرمی اور عجب پیار کے ساتھ بولا "چاچا"!

اُمانا تھ جس نے پہلی بار خلیل کی بات کو سُنی اَن سُنی کر دیا تھا۔ بناوٹی طور پر جھلّا کے کہا: "کیا ہے بے؟"

"چاچا تم ناراض تو نہیں ہو؟" خلیل نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی بناوٹی تسلّی کے طور پر پوچھا۔ اُمانا تھ نے پائپ کو ایک جھٹکا دیا اور اُسے دوبارہ جلانے کے لیے دیا سلائی جلا جلا کر سلگانے لگا۔

"چاچا۔ تم پائپ والوں نے کسی دیا سلائی کمپنی کے Shares تو نہیں خرید رکھے ہیں؟"

"تو مطلب کی بات کر۔"

"چاچا۔ وہ آجکل پرتھوی تھیٹرز آیا ہوا ہے نا!"

"تو ترزی کو لے جانے کے لیے پیسے چاہیئے ہونگے ؟" اس نے منہ سے پائپ نکالتے ہوئے کہا۔ مگر خلیل گھن چکر۔ "تجھے خیال ہے کہ مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو پیسے کہاں سے آئیں گے ؟"

"ہائے! ہائے!" خلیل نے اپنے گال پر ہلکا سا طمانچہ مارتے ہوئے منہ لٹکا لیا۔

"کیوں بے کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بھابی سمترا کی تو قسمت پھوٹ گئی!" اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیال بھیا تمہاری ہی جیب میں کچھ پیسے ہوں تو اُمانا تھ کو اُدھار دے دو۔" ہم دونوں کو اُمانا تھ کا بھتیسر سے لگاؤ اچھی طرح معلوم تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اپنی آمدنی اور اخراجات کا اندازہ لگایا۔ بھلا ڈیڑھ سو روپے میں خرچ ہی کیا سکتا تھا۔ پچاس روپے لوٹس ریسٹورانٹ گئے، ساٹھ روپے میں مکان اور ناشتہ وغیرہ کا حصّہ۔ بیس روپے ہیں۔ اخبار، نوکر دھوبی اور دوسرے مشترکہ اخراجات۔ لے دے کے بیس روپے بچتے تھے جس میں سارا مہینہ گذارنا ہوتا تھا۔ اور پھر اُمانا تھ کے پاس بھی پیسے کہاں ہوتے یہ ضرور تھا کہ ہم تینوں میں سے اُسکا مالی مرتبہ ذرا زیادہ اونچا تھا۔ اُسے شاید ڈھائی سو ملتے تھے لیکن اس اعتبار سے اسکے اخراجات بھی زیادہ تھے جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا۔ اُمانا تھ پائپ کے بنا ادھورا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ پائپ پیتا تھا کیونکہ بقول کسی عقلمند آدمی کے کم سے کم آپ اپنا پائپ تو دوسروں کو پیش نہیں کر سکتے لہٰذا سگرٹوں کی نسبت پائپ کسی حد تک اقتصادی

لحاظ سے بہتر رہتا ہے۔ بہرحال باپ سے قطع تعلق اُسکے ملنے والوں اور دوستوں کا دائرہ بھی وسیع تھا۔ اور پھر خلیل بیچارا تو محض سروس میکنک تھا جسے بمشکل ہفتہ میں چھ گھنٹے کام ہوتا۔ اسے بھی سوا سو یا ڈیڑھ سو سے زیادہ کیا ملتا ہوگا۔

مہینے کی اٹھائیس تاریخ ہونے کا اثر مجھ پر سب سے زیادہ تھا۔ میں نے سوچ بچار کے بعد کہا۔

"بھئی اس لحاظ سے تو میں کم سے کم پیدائشی طور پہ کچھ بدقسمت واقع ہوا ہوں یہاں کبھی ٹکا بھی نہیں بچا!"

"ہائے اب کیا ہوگا!" خلیل نے ایک بناوٹی سرد آہ کھینچی۔ "خیر اُمانا تھ۔ فکر نہ کرو تمہارے دس روپے دینے تھے نا۔ میں چار ٹکٹ لے آیا ہوں۔ یہ لو بھابی اور تمہارے دو ٹکٹ کل شام کے۔ آج میں اور دیال جائیں گے۔ ہم تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے! تو شام کو چلوگے دیال گورو گھنٹال!"

اُمانا تھ نے دونوں ٹکٹ تھام لیے۔ اسکی آنکھیں شدت جذبات سے نم ہوگئیں۔

"حضور یہ بندہ نواز دیال کو گورو گھنٹال کے لقب سے کب سرفراز کیا؟" اور میں نے اُسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیوں گھسیٹتے ہو، لزی کو کیوں نہیں لے جاتے؟"

"ہائے! ہائے!" خلیل نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ٹکٹ لایا تو اُسی کمبخت کے لیے تھا مگر کیا کروں وہ اپنا پروگرام ہمشیرہ صاحبہ کے ساتھ

کہیں اور جانے کے لیے بنا بیٹھی ہے! نہیں لے جاؤنگا اسے اب کبھی نہیں لے جاؤں گا!" خلیل جوش میں آکر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

کبھی نہیں لے جاؤگے؟ یا صرف آج شام کے لیے!" امانا تھا نے ہاتھ میں پائپ نچاتے ہوئے کہا۔

"ہائے چاچا! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے!" وہ بناوٹی طور پر شرما کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔" تم گورو ہو! تم تو سب کچھ جانتے ہو!"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

لزی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور شاید اُمانا تھا نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن خلیل کے کہنے کے مطابق وہ ایک لانبے قد کی نازک اندام کرسچین لڑکی تھی جسکے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ اُس کے شانوں تک کٹے ہوئے سیاہ بال، اُسکی بڑی بڑی آنکھوں اور بات بات پر سر کو خفیف سی جھٹک دینے کی ادا پر خلیل بُری طرح سے فریفتہ تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ وہ مائیک کے ہاں اُسے ایک دعوت پر ملا تھا۔ مائیک ایک ٹریولنگ ایجنسی کے ساتھ وابستہ تھا۔ بڑے مزے کا آدمی تھا۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اس دعوت کے بعد خلیل کی زندگی ایک نئے مرکز کے گرد گھومنے لگی۔ دفتر کے بعد میری دلچسپیاں بھی کسی حد تک محدود تھیں کافی ہاؤس میں جہاں ادب نواز دوستوں کے ساتھ دلچسپ شامیں گزارنا میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اِن دلچسپیوں کے پس منظر لزی اور خلیل، اُمانا تھا اور سمترا کے رومان کی دھڑکنیں اکثر سُنائی دیا کرتیں۔

٭ ٭ ٭ ٭

اور پھر ایک دن خلیل نے اچانک بتایا کہ اس کا تبادلہ ناگپور ہو گیا ہے اُما ناتھ یہ خبر سُن کر ایک عرصہ تک خاموش پائپ کے کش لگاتا رہا اور افسردہ سا ہو کر خالی فضا میں گھورتا رہا۔

خلیل خود اس تبادلہ سے چنداں خوش نہیں تھا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ تبادلہ کے آرڈرز کینسل ہو جائیں لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ اُسے ہم سب سے بچھڑنے کا غم تھا —— لکھنؤ سے، لوٹس اور حضرت گنج کی رومان پرور فضاؤں سے۔ اُما ناتھ کی موسیقی اور لوک گیتوں سے، میری کہانیوں سے، مائیک کی دعوتوں سے اور لزی کی والہانہ محبت سے! وہ خود کئی دن تک پریشان رہا۔ اُما ناتھ بھی اکثر خاموش رہتا۔ میری طبیعت بھی اکثر بجھی بجھی رہتی۔ اب بات بات پر قہقہے نہ لگتے، ہم مذاق اپنی رنگینی کھو بیٹھے۔ خلیل اب بھی اس فضا میں زندگی لانے کی کوشش کرتا اُما ناتھ اور سمترا کے بارے میں مذاق ہوتا لیکن جیسے ان سب کے پس منظر ماحول میں ایک افسردگی تھی، بے رونقی تھی جسے سب جانتے تھے لیکن جس کا اعتراف کرنے سے ہچکچاتے تھے۔

خلیل کبھی کبھی غصہ میں آ کر اپنے افسرانِ بالا کو اس تبادلے کے لیے کوستا جو اُسے لزی سے جدا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن اُما ناتھ اُسے سمجھاتا کہ آخر لکھنؤ اور ناگپور دونوں ہندوستان میں ہی تھے اور جن میں کوّے کی اُڑان (ڈکوٹا تو اور بھی لمبے سفر پر جاتا تھا!) محض دو سو میل تھی اور پھر لزی کے لکھنؤ ہونے کا یہ فائدہ تھا کہ وہ اس بہانے کبھی کبھی دوستوں

سے ملنے بھی آجایا کریگا۔ لیکن کیا معلوم! ایسا ممکن ہو سکے یا نہ ہو سکے یہ کہنا کچھ مشکل تھا! خلیل نے تہیّہ کر لیا وہ لزی سے جلد از جلد شادی کر لیگا لیکن کم عمری کے تقاضے سے یہ اچھا ہوگا کہ اُمانا تھ اور میں پہلے شادی کرلیں۔ ہاں اگر ہم لوگوں کی وجہ سے اگر کچھ غیر معمولی تاخیر ہوئی تو اُسے مجبوراً کوئی ایسا قدم اُٹھانا پڑے گا جو بزرگوں کی شان میں گستاخی ہوگا!

اور پھر نومبر کی ایک حسین رات میں جبکہ امرود کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی پڑی تھیں اور فضا میں خنکیاں رواں تھیں، خلیل چلا گیا ــــ اُمانا تھ، ہمترا، اور میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہوائی اڈے پر خلیل کو الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ خلیل شام سے ہی غائب تھا۔ اُمانا تھ اور میرا قیاس تھا کہ وہ لکھنؤ کی اس آخری یادگار شام کو لزی کے ساتھ کہیں تنہائی میں لا مارٹینیر کی چھوٹی سی جھیل کے پاس یا چھتر منزل کے قریب گومتی کے کنارے ریذیڈنسی کے کھنڈروں میں ہوگا۔

خلیل کے کہنے کے بموجب لزی چند مصلحتوں کی بنا پر ہوائی اڈے پر نہ آسکی تھی۔ ہوائی اڈے کے میدان میں ٹمٹماتی ہوئی مشعلیں ہوائی جہاز کو راستہ دکھانے کے لیے روشن تھیں۔ دور آسمان کے پچھمی کنارے سے جگنو کی طرح چمکتی ہوئی ہوائی جہاز کی سُرخ و سفید اور سبز روشنیاں نمودار ہوئیں۔ کنٹرول ٹاور کی گھومتی ہوئی بیکن لائٹ ہوائی جہاز کے اڈے کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی اور پھر ایکا ایک تاریکی کو چیرتا ہوا

نہ جانے کہاں سے جہاز ٹمٹماتی ہوئی مشعلوں والی سڑک پر تیزی سے دوڑتا ہوا ہمارے سامنے آ کر رک گیا —— خلیل ہاتھ ہلاتا چند ہی منٹ میں اس جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ اُمانا تھ دیر تک اپنا سفید رومال ہلاتا رہا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہہ رہے تھے —— فضا یکدم اور بھی خاموش ہو گئی تھی۔ ہوائی اڈے کی ٹمٹماتی روشنیاں دیر تک ان کی وسعتوں پر —— خاموش لہراتی رہیں۔!

* * * * *

پچھلے دنوں تقریباً سات سال کی غیر حاضری کے بعد جب میں لکھنؤ گیا تو اُمانا تھ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ پچھلے سال ہی پانچ سال کے بعد جنوبی امریکہ کے کئی قبیلوں کی لوک دھنیں اکٹھی کر کے لوٹا تھا۔ اُس کی شادی ایک عرصہ ہوئے سمترا سے ہو چکی تھی اور ان کے اب دو بچے تھے۔ میں بھی اب ازدواجی زنجیروں میں کچھ عرصہ ہوا جکڑا جا چکا تھا۔ ماضی کی حسین یادوں کو کریدتے کریدتے خلیل کا ذکر چل نکلا۔

"تو پھر خلیل کبھی تمہیں یا لزی کو ملنے لکھنؤ نہیں آیا؟" میں خود خلیل کے تھوڑا عرصہ جانے کے بعد ہی لکھنؤ سے چلا آیا تھا۔

اُمانا تھ اپنے مخصوص انداز میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اپنا پائپ پی رہا تھا۔ اس نے یہ سنتے ہی منہ سے پائپ نکالا اور کرسی کے بازو سے جھٹکاتے ہوئے کہا۔

"نہیں دیال۔ میں بھی تو اس دوران میں ہندوستان سے پانچ سال باہر رہا ہوں"

اور پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار دیال پچھلے دنوں نائیک سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے یونہی لزی کے بارے میں پوچھا تھا۔ جانتے ہو وہ کیا کہہ رہا تھا!"

میں نے اشتیاق بھری نظروں سے اُسکی طرف دیکھا۔

"لزی خلیل کی ایک من گھڑت فرضی محبوبہ تھی۔ اُس نے کبھی کسی لزی کا تعارف خلیل سے نہیں کروایا!"

مجھے یہ سُن کر بیحد اچنبھا ہوا۔ چونکہ ہم میں سے کسی نے بھی لزی کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ کچھ صحیح معلوم ہوتا تھا۔

"لیکن —— لیکن اُمانا تھ وہ ——" میرے دماغ میں چند سوال کلبلائے "وہ اُن پیسوں کا کیا کرتا تھا جو تم سے اور مجھ سے لزی کے نام پر مانگا کرتا تھا! یاد ہے تم اور میں کس طرح اپنی اشد ضرورتوں کو بھی بالائے طاق رکھ کر اسکی مدد کیا کرتے تھے! لیکن ایک وصف تھا اُس میں کہ عین وعدہ کے مطابق پیسے لوٹا دیا کرتا تھا!"

اُمانا تھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"دیال تم گمان بھی نہیں کر سکتے کہ اس کی تنخواہ ہم دونوں سے کہیں زیادہ تھی۔ نائیک کہتا تھا اُسے ساڑھے تین سو ملتے تھے!"

"ساڑھے تین سو!" میرا دماغ اور بھی الجھنوں میں پھنس گیا، لیکن —— پھر وہ آخر ہم سے اُدھار کیوں مانگا کرتا تھا؟"

اسلئے کہ" اُمانا تھ نے لائیٹر سے پائپ جلاتے ہوئے کہا" اسلئے کہ ہم

دونوں میں سے کوئی اُس سے اُدھار نہ مانگ لے !"

میں حیرت سے اُمانا تھ کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور ہم دونوں کے ذہن میں خلیل کی تصویر گھوم رہی تھی ـــــ خلیل خاں جو فاختہ اُڑانے کی بجائے آجکل ڈیکوٹا اڑاتے تھے !

نحوست

"یہ پتھر کس نے پھینکا ہے؟"

اجنبی نے گاؤں کے جوہڑ کے کنارے کھڑے ہوئے بچوں کو استفسارانہ نگاہوں سے دیکھا۔ قریب ہی آم کے درخت کا بوجھل سایہ آگ کی لو کی طرح چمکتے ہوئے پانی میں تیر رہا تھا۔

"یہ پتھر کس نے مجھے مارا؟" اجنبی نے اپنے سوال کو پھر دُہرایا۔

بچے اُس کی طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ بچوں کے کپڑے پھٹے پُرانے تھے اور سب کی عمر تقریباً دس بارہ برس تھی۔

اجنبی کی تیز نگاہیں ہر بچے کا انفرادی طور پر جائزہ لے رہی تھیں۔ اُنکی نگاہیں ایک چھوٹی سی لڑکی پر آکر رُک گئیں۔ لڑکی نے اپنی چوٹیوں میں دو سفید ربن باندھ رکھے تھے۔ اُس کا سانولہ چہرہ دلآویز اور اُبھرے ہوئے نقوش کے باوجود کچھ زیادہ خوبصورت نہ تھا لیکن وہ یقینی طور پر باقی بچوں سے مختلف تھی۔ کوئی گروہ میں سے چلا اُٹھا: "نحوست نے مارا ہے!"

ایک بھونڈی شکل کے بچے نے گروہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اُس کی تنگ پیشانی، اندر دھنسے ہوئے گال، چپٹی ٹھوڑی اور کدو جیسے سر کو دیکھ کر ہی متلی سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چند لمحوں تک ہچکچایا اور پھر

پھر آگے بڑھا۔

"ہاں میں نے پتھر مارا تھا لیکن ــــ آپ کو نہیں ــــ میں تو اِن آموں کو گرا رہا تھا" اُس نے آم کے درخت کی طرف اشارہ کیا جہاں پکے ہوئے آم لُو کے گرم جھونکوں سے لرز رہے تھے۔ پھر وہ اجنبی کی طرف یوں سہمی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ اُسے کہیں تھپڑ نہ مار دے!

"شاباش! میں خوش ہوں تم نے سچ بولا!" اجنبی اُس کے قریب آیا اور اُس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اجنبی نے نہایت پیار اور نرمی سے پوچھا۔

"نحوست"

"نحوست!" اجنبی کو حیرانی ہوئی۔ "بیٹا اس کا مطلب تو بدشگونی ہے۔ تمہیں ایسا کیوں کہتے ہیں؟"

"میں ہر کسی کے لیے منحوس ثابت ہوا ہوں نا! کم سے کم ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ میرا اصلی نام شمّو ہے۔ شیام!" اُس نے نہایت معصومیت سے کہا۔

"کہاں رہتے ہو بیٹا؟"

"رجو اور میں اکٹھے رہتے ہیں۔ وہ! وہاں گاؤں کے اُس کونے میں!" اُس نے سفید ربنوں والی سانولی لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "رجو میرے چاچا کی لڑکی ہے"

یکایک اُس کی پیشانی کے شکن گہرے ہوتے چلے گئے۔ کوئی چیز اُس کے حلق کے قریب آ کر پھڑپھڑانے لگی۔ وہ اجنبی کے چہرے کی طرف اضطراب بھری

نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کچھ پوچھنا چاہتے ہو بیٹے؟"

"ہاں ـــــ آپ میرے ـــــ میرے سچ بولنے پر بہت خوش ہوئے ہیں۔ لیکن گھر میں تو ـــــ مجھے سچ بولنے پر مار پڑتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ـــــ رجو کئی بار جھوٹ بولتی ہے۔ لیکن اُسے کوئی نہیں مارتا ـــــ کیا ـــــ کیا سچ بولنا اچھی بات ہے؟"

"ہاں بیٹے!"

"میرے بابا بھی یہی کہتے تھے" اُس کا چہرہ فخر سے تمتما اُٹھا: جب میں سات سال کا تھا تو وہ چلے گئے۔ بہت دور۔ ہمارے گاؤں کا بڈھا بنسی کہتا ہے وہ ایشور کے پاس چلے گئے ہیں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے ـــــ لیکن رجو کو جھوٹ بولنے پر کیوں نہیں سزا ملتی؟" وہ چہک کر بولا۔

"ملے گی بیٹا۔ جب وہ ایشور کے پاس جائے گی" اجنبی ایک لمحہ کے لیے خاموش رہا اور پھر اُس نے پوچھا۔

"کیا تمہیں مار پڑتی ہے؟"

"ہاں بہت۔ جب میرا کوئی قصور نہیں ہوتا تب بھی مجھے مارتے ہیں"

"تمہاری ماں ـــــ؟"

"بچپن ہی میں مر گئی۔ سب کہتے ہیں میں پیدا ہوتے ہی سب کے لیے بدقسمتی لایا ہوں"

اجنبی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اُس نے بچے کی طرف رحم بھری

نگاہوں سے دیکھا اور پھر اُس نے اپنی جیب میں سے ایک اٹھنّی نکالی۔

"بیٹا۔ اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں" وہ بڑبڑایا اور اُس نے اٹھنّی بچّے کی ہتھیلی پر رکھ کر اُسے بند کر دیا۔ "جاؤ بیٹے۔ شاید یہ تمہارے کسی وقت کام آسکے۔" اور وہ یہ کہہ کر کسی سوچ میں غرق آہستہ آہستہ چل دیا۔

* * * * * *

بچّہ حیران رہ گیا۔ کہاں تو یہ خیال کہ اُسے مار پڑے گی اور کہاں اُسے یہ چمکتی ہوئی اٹھنّی مل گئی۔ کیا اس شخص کے ہوش و حواس ٹھیک تھے؟ اُس کا چھوٹا سا ذہن کچھ نہ سمجھ سکا۔ اُسے یاد تھا کہ ایک دن وہ رسوئی کی طرف گیا تھا جہاں اُس کی چچی کام کر رہی تھی۔ بدقسمتی سے جونہی وہ اندر داخل ہوا دودھ اُبل کر ہنڈیا سے باہر گر گیا۔ اور پھر اُسے خوب مار پڑی کیونکہ وہ نحوست تھا اور ہر کسی کے لیے منحوس ثابت ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچا کیا وہ واقعی اِن حادثوں کا ذمہ دار تھا؟ اُسے تنبیہ کر دی گئی تھی کہ جب کوئی گھر سے باہر کسی کام کے لیے جائے تو وہ کبھی دروازے کے قریب بھی نہ پھٹکے کیونکہ اُس کی موجودگی ضرور مضر ثابت ہوتی تھی۔

اُسے یاد تھا کہ ایک بار یونہی وہ دروازے کے قریب کھڑا ہوا تھا کہ اُسکے چاچا منڈی گئے۔ اُسی دن اُن کو سو روپیہ سے بھی زیادہ کا نقصان ہوا۔ گھر آنے پر جب چچی نے بتلایا کہ وہ دروازے کے قریب کھڑا تھا تو اُن کی آنکھیں غصّے سے لال ہو اُٹھی تھیں۔ اور اُسے اُس دن کی مار آج تک یاد تھی۔ اُس کی ہڈیاں کئی دن تک چرچراتی رہی تھیں اور وہ راتوں درد کے مارے سو نہیں سکا تھا۔

اُس دن اُس کے کان کھینچ کر اُس پر واضح کر دیا گیا تھا کہ جب تک ہر شخص اپنے اپنے کام پر نہ چلا جایا کرے۔ وہ اپنی شکل تک نہ دکھائے۔ لیکن یہ اجنبی......

* * * * *

اچانک وہ اپنی خیالی دُنیا سے چونک پڑا۔ رجّو اُس کے نزدیک اپنا گروہ لیے کھڑی تھی۔

"تم میری بابت اُس سے کیا کہہ رہے تھے؟" اُس نے دونوں ہاتھ کولھو پر رکھ کر ایک عجیب سا منھ بناتے ہوئے پوچھا۔ اور اُس کی نگاہیں نحوست کی بند مٹھی پر بھی جم گئیں۔

"اس میں کیا ہے؟ اُس نے کیا دیا ہے تمہیں؟" اُس نے گرج کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ اٹھنّی"

"اٹھنّی! مارنے کے لیے کیا؟ ایسا معلوم ہوتا تو ہم اُسے پتھروں سے مار مار کر ادھ موا کر دیتے۔ کیوں رجو؟" کوئی قہقہہ لگاتے ہوئے بول اُٹھا۔

"بکواس بند کرو" نحوست کی آنکھیں غصّہ سے لال ہو گئیں" وہ بہت بھلا آدمی تھا!"

"بھلا آدمی!"! سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"نحوست۔ یہ اٹھنّی ہمیں دے دو۔ اچھی خاصی دعوت رہیگی۔ رام دانے کے لڈّوں کی؟ کیوں سا جا؟" ساجا نے رجو کی تائید میں سر ہلا دیا۔

"نحوست یہ مجھے دے دو۔ ورنا!" رجو نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

"لیکن اُس نے تو — اُسے نے تو مجھے دی تھی"!

"چھین لو نحوست کے بچے سے۔ ایسے تھوڑی دیگا!" رجو چلائی۔ دو تین لڑکے آگے بڑھے۔

"نہیں رجو۔ یہ تو میں تمہیں خود ہی دینے والا تھا" جب وہ چھینا جھپٹی کرنے لگے تو نحوست نے کہا۔

"تو لاؤ" ساجا نے ہاتھ پھیلا دیا۔

"نہیں تمہیں نہیں — میں رجو کو دونگا"!

"اچھا — تو دو مجھے" رجو نے اپنا نرم ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

نحوست نے ہچکچاتے ہوئے اٹھنی اُس کی گوری گوری ہتھیلی پر رکھ دی۔ اُسکی آنکھیں قربانی کے ایثار سے چمک اُٹھیں۔ خوشی کی ایک لہر سارے گروہ میں دوڑ گئی۔ اور سب کے سب گاؤں کی طرف بھاگ گئے۔ نحوست وہیں کھڑا اِن کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ اتنی دور سے بھی رجو کی سیاہ چوٹیوں میں لگے ہوئے ربنوں کو پہچان سکتا تھا!۔

※ ※ ※ ※ ※ ※

نحوست یہ جاننے سے قاصر تھا کہ وہ کیوں رجو کی ضد کے سامنے اپنا سر جھکا دیتا تھا۔ رجو کچھ زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن اس طرح شہری انداز میں ربن لگانے سے وہ واقعی بھلی معلوم ہوتی۔ اُس کو دیکھتے ہی اُس کا دِل دھک دھک کرنے لگتا۔ اُسے اُس کی قربت اچھی لگتی۔ وہ اُسے اپنے بھولے بھونڈے انداز میں خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا لیکن رجو کی بے رُخی اور سرد مہری

اُسے اچھی نہ لگتی۔

جب کبھی وہ اکیلا ہوتا تو یہ خیال کہ تمام لوگ اُس کے سائے سے دور بھاگتے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو لے آتے۔ اپنی بدصورتی کا احساس اُسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتا۔ وہ اکثر رات کو لیٹے لیٹے چارپائی پر اس کے متعلق سوچتا رہتا۔ سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ رات کی دیوی اپنے سیاہ آنچل کو سمیٹتی ننھے ننھے تاروں سمیت رخصت ہو جاتی اور روشنی کی لمبی لمبی سپید سنہری کرنیں بادلوں کی اوٹ سے دُنیا کو منوّر کرنے لگتیں۔ کسانوں کی مدھ بھری بنسی کی تانیں، کھیتوں کو جاتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیوں کی مدھر آوازیں اور گاؤں کی الھڑ دوشیزاؤں کے وجد آور نغمے بھی اُسے ایسا سوچنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ وہ سوچتا اور سوچتا ہی چلا جاتا تاآنکہ اُس کے خیالات بلوتے ہوئے دودھ کی جھر جھر اور اُس کی چچی کی غصّہ بھری آوازمیں ڈوب جاتے جو کہ اُسے اس کی کاہلی پر کوستی تھی۔

* * * * * *

رجّو نے اُس روز یہ ربن پہلی بار باندھے تھے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اُسے بھی ہر شہری فیشن کو جلد از جلد نقل کرنے کی فکر دامنگیر رہتی۔ اُس کا باپ منڈی سے لوٹتی بار یہ ریشمی ربن اُس کے لیے لایا تھا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے جلدی جلدی نہا کر شہری انداز میں دو چوٹیاں گوندھیں اور اُن میں یہ ربن لگا لیے۔ بہت عرصہ تک وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ان ملائم ربنوں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر وہ گھر والوں اور اپنی سہیلیوں کو دکھانے کے لیے باہر بھاگ گئی

"یہ ربن اچھے لگتے ہیں کیا؟" وہ ہر ایک سے پوچھ رہی تھی اور تعریف سُنکر بیحد خوش ہوتی تھی۔

"رجو تم بہت اچھی لگتی ہو؟" جب سب تعریف کر چکے تو نحوست نے کہا اُس نے رجو کی سہیلیوں کو ان سفید ربنوں کو چھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یکایک ان ربنوں کی ملائمت سے لطف اندوز ہونے کا خیال اُس کے دل میں بھی پیدا ہوا۔

"تم تو آج پریوں کی رانی معلوم ہو رہی ہو۔ رجو تم روز ربن کیوں نہیں باندھتی؟ کتنے پیارے ہیں یہ؟ میں — میں ذرا ہاتھ لگا کر دیکھ لوں؟"

"چل ہٹ نحوست کے بچے۔ مجھ پر بھی کوئی آفت لاکر رہے گا" رجو نے اُسے جھڑک دیا۔

نحوست سارا دن ان ربنوں کی بابت سوچتا رہا۔ شاید رجو کو اور کوئی رنگ بھلا نہ معلوم ہوتا ہو۔ اُس کے بالوں میں یہ سفید ربن کسی سیاہ جھیل میں تیرتے ہوئے کنولوں کے مانند تھے۔ اُس نے رجو کو کئی مرتبہ دیکھا تھا، لیکن ان ربنوں نے واقعی اُسکی خوبصورتی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ وہ دوسرے معاملوں کے بارے میں سوچنے کی بیحد کوشش کرتا رہا لیکن بار بار سفید ربن اسکی آنکھوں کے سامنے آکر پھڑ پھڑانے لگتے۔

شام کو جب وہ گھر آیا تو اُس نے اپنے چاچا کو چارپائی پر بیٹھے پایا اُس کے چاچا کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی سُلگ اُٹھیں اور اُس نے اپنا بید اُٹھایا۔

"نحوست۔ تم آج دوسروں سے ہماری بابت کیا کہتے رہے ہو؟"

وہ غرّایا۔
"میں نے کتنی بار تمہیں دوسرے لوگوں سے باتیں کرنے سے منع کیا ہے"
اُس کی چچی غصّہ سے بھری رسوئی سے باہر آ گئی "بے شرم! مر کیوں نہیں جاتا۔ کہیں جا کے؟ کمبخت کو موت بھی تو نہیں آتی۔ پہلے ماں کو کھایا پھر باپ کی جان لی۔ اب ہم لوگوں پر کوئی آفت لائے گا؟" اُس کی چچی کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔
"او ناشکر گزار کمینے لڑکے! کیوں تو نے ہماری جان آفت میں ڈال رکھی ہے؟"
نحوست نے کانپتے ہوئے بید کی طرف دیکھا۔
"جس کا کھائے اُسی کی تھالی میں چھید کرے۔ بدتمیز!" اُس کی چچی نے لقمہ دیا۔
"دیکھتا ہوں اب تم کیسے شکایتیں کرو گے۔ نامراد! کھا کھا کر بھینسا ہوا جا رہا ہے"
اس کے ساتھ ہی چھڑی ہوا میں لہرائی اور سسش کی آواز سے نحوست کی پیٹھ پر پڑی نحوست کراہ اُٹھا "اب پھر ایسا کرنے کا نام لو گے؟ بول سُور" چھڑی پھر اُٹھی اور اُس کی برہنہ ٹانگوں پر پڑی "بول تیری ایسی کی تیسی!"
اور نحوست کا چاچا بے تحاشہ اُسکے جسم کے ہر حصّے پر مارے چلا جا رہا تھا۔
جب نحوست رات کو چارپائی پر لیٹا تو اُس کا جسم درد سے اکڑا جا رہا تھا اُس نے سونے کی کوشش کی لیکن اُسے نیند نہ آئی۔ اُس کے جسم کے کئی حصّے سوج گئے تھے اور جگہ جگہ گہرے نیل پڑ گئے تھے۔ پھر یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہو رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ اُسے

درد سے چھٹکارا مل گیا، آس پاس کی تمام پڑی ہوئی چیزیں وسیع اندھیرے میں تحلیل ہوتی گئیں اور وہ ...... یکایک اُسے دو قوی ہیکل دیو اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیئے۔ اُس نے تیز دوڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بیحد تھکا ہوا تھا اور اس کے عضو عضو میں درد ہو رہا تھا۔ وہ دونوں دیو قریب آتے گئے حتیٰ کہ وہ اُسے تقریباً چھو سکتے تھے۔ پھر اچانک یہ تصویر غائب ہوگئی اور اُس کی جگہ دو ربن پس منظر میں نمایاں ہوگئے۔ ہوا میں یہ ریشمی ربن لہرانے لگے، اُس کی آنکھیں بہت دیر تک اِن کا نظارہ کرتی رہیں۔ اُس کے ہاتھوں نے بڑھ کر انہیں چھو لیا، اور وہ دیر تک اِن ربنوں کو پیار سے سہلاتا رہا۔ صبح والے اجنبی کی شفقت بھری آنکھیں فضا کے ایک گوشے میں سے اُس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں اور ــــ پھر آنکھ کھُل گئی۔ ایک دفعہ پھر اُسے ناقابل برداشت درد کا احساس ہوا۔ صنوباش آسمان میں چند بادل اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے اُس نے چاروں طرف سر پھیر کر دیکھا۔ سب ہی سو رہے تھے۔ یکایک چاند کی روشنی میں کوئی چیز چمکی۔ اُسے لاشعوری طور پر رجو کے ربنوں کا خیال آیا۔

اُس کے دِل میں اِن ربنوں کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کی ایک زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ وہ ہمت کر کے اُٹھا اور رجّو کے بستر کی طرف لنگڑاتے ہوئے پہنچا۔ وہ ایک گہری معصوم نیند سو رہی تھی۔ اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھے۔ اور جلدی جلدی اِن ربنوں کی گرہ کو کھولنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد دو دھیا ملائم ربن اس کے ہاتھوں میں آ گئے۔ ایک فاتحانہ چمک اُس کی آنکھوں میں کوند گئی۔ اچانک رجو نے کروٹ بدلی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ

اُسکے لبوں پر رینگ رہی تھی۔ گویا اُس نے نحوست کو معاف کر دیا ہو۔ وہ چند لمحوں تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر آہستہ آہستہ لنگڑاتا اپنے بستر کی طرف چلا گیا۔

صبح اپنے ساتھ خوش نوا پرندوں کے گیت، بنسری کی رسیلی تانیں اور کھیتوں کو جاتے ہوے بیلوں کی گھنٹیوں کی نقرئی آوازیں لیے ہوے آئی، بدبخت نحوست مردہ پایا گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں دو سفید ربن تھے جو کہ اُس نے مضبوطی سے سینے کے ساتھ چمٹا رکھے تھے۔

کیڑے

لیلا کتاب پڑھتے پڑھتے یکایک چونکی جیسے اسے کسی بات کا خیال آگیا ہو۔ وہ جلدی سے اُٹھی، وقت بھی کتنی جلدی گذر جاتا ہے! مسز گپتا تین چار روز میں ہی تو جانے والی تھیں اور لیلا نے اس کے اعزاز میں منگل کو ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ پھر اس نے گھنٹوں سوچنے کے بعد اپنے لیے ایک نئی ساڑھی کا ڈیزائن تجویز کیا تھا۔ وہ سارا بازار چھان کر اس کے لیے بارڈر لائی تھی۔ یہ ساڑھی اس موقعہ پر شام کی ارغوانی روشنی میں کتنی بھلی معلوم ہوگی اور پھر اس کا ڈیزائن بیگم دُرّانی کی ساڑھی سے کس قدر بہتر تھا! کس قدر تعریف کی تھی سب نے بیگم دُرانی کی ساڑھی کی! اس کی ساڑھی کا ڈیزائن یقیناً زیادہ تعریف کا مستحق ہوگا۔

لیلا نے اُٹھ کر سوٹ کیس میں سے ساڑھی کا کپڑا نکالا اور پھر اس پر اپنے انتخاب شدہ انداز میں بارڈر لگا کر تنقیدی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل گئی۔

"مالن! مالن" لیلا کی آواز برآمدے میں سے دوپہر کے سنّاٹے کو چیرتی کوٹھی میں آگونجی۔

"کمبخت کو اپنے بچوں سے ہی فرصت نہیں ملتی" اس نے جواب پا کر کہا۔

اس کے چہرے کی خوشی اضطراب میں تبدیل ہوگئی اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ کڑکتی آواز سے مالن کو پکارا۔

"بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ چپ کرا رہی تھی، سُلا رہی تھی۔ ہاں کوئی بہانہ تو اسے مل ہی جائے گا"۔

اِن بچوں نے تو جان آفت میں ڈال رکھی ہے۔ کوئی کام ٹھیک سے ہو ہی نہیں پاتا اور پھر ہر سال چلی آ رہی ہے یہ لائن ڈوری ختم ہونے ہی نہیں آتی" نیلا نے جھنجھلا کر کہا "اب کون لگائے بارڈر اس ساڑھی پر؟"

اچانک اسے سامنے سے شامو جاتا دکھائی دیا۔

"شامو"

"جی سرکار"

"ذرا مالن کو بھیج دو"۔ چلّاتے چلّاتے حلق خشک ہوگیا ہے کمبخت سنتی ہی نہیں"

وہ پھر اپنی ساڑھی کو غور سے دیکھنے لگی۔

اتنے میں آہستہ سے کمرے کی چق اُٹھی اور مالن ایک بچے کو گود میں لیے داخل ہوئی۔

"کہاں تھی تو۔ بہری ہوگئی تھی کیا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر آدھ گھنٹے سے چلّا رہی ہوں"۔

"بی بی جی۔ لڑکے کے پیٹ میں درد ہے"۔ اس نے گود میں اُٹھاتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بڑے زور سے چلّا رہا تھا اسی لیے آپ کی آواز کانوں میں نہیں پڑی"۔

"یہ بچے" کیا جان کا وبال بن گئے ہیں! آج یہ بیمار ہے کل وہ بیمار!" لیلا نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"یہ دُکھ سُکھ تو گرہستی کے ساتھ ہے بی بی جی"

"گرہستی کے ساتھ ہے" لیلا نے اِن لفظوں کو جان کر دُہراتے ہوئے کہا۔ جیسے وہ ان کا مذاق اُڑانا چاہتی ہو" اچھا۔ یہ لو۔ یہ بارڈر اس ساڑھی پر ٹانکنا ہے۔ لیکن ہوشیاری کے ساتھ۔ پہلے یوں۔ اور پھر یوں" اس نے ڈیزائن بتلاتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کیجئے" اس نے سوئے ہوئے بچے" کو فرش پر لٹاتے ہوئے کہا اور جلد ہی وہ بارڈر ٹانکنے میں مصروف ہو گئی۔

"یہ ساڑھی کا کپڑا تو بہت پیارا ہے بی بی جی اور پھر یہ بارڈر تو بہت بھلا معلوم ہو گا"

"اچھا اب تو کام کیے جا۔ زیادہ باتیں مت بنا" لیکن وہ دل ہی دل میں اس تعریف پر نہایت خوش تھی۔

وہ صوفے پر لیٹی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگی۔ اس نے نئے نئے فیشنوں کی ایک باتصویر میگزین اُٹھائی اور تصویروں کو دیکھنے لگی۔

لیلا کا شوہر ایک اعلیٰ عہدہ پر ممتاز تھا۔ اس کی شادی ہوئے چار سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیلا کو دراصل بچوں سے سخت نفرت تھی۔ اسے کالے کالے سڑ سڑ کرتی ہوئی سرخ ناک والے یا ہاتھی کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے بچے" جن کی آنکھوں میں گدیں

تیراکریتیں پسند نہ تھے ۔ وہ ان الجھنوں سے دور رہنا چاہتی تھی۔ اسے بچے شروع سے ہی ناپسند تھے کیونکہ اسے کبھی بچوں کی ذمہ داری کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ وہ بچپن سے جوانی تک اپنے گھر میں بالکل اکیلی رہی تھی۔ گڑیوں کے کھیل وغیرہ سے شروع سے ہی اسے سخت نفرت تھی۔ وہ لڑکوں کے کھیلوں میں بڑے اشتیاق سے حصہ لیتی اور اگر اس میں کوئی نسوانی جز تھا تو وہ طرح طرح کے کپڑے پہننے کا۔ اس کا جسم تندرست اور دلآویز تھا وہ جو بھی لباس پہن لیتی اسے سج جاتا۔ اس کے علاوہ ایشور نے اس پر رنگ روپ کی مایا چھڑکی تھی اسکی آواز میں ایک مردانہ جاہ و جلال ہوتے ہوئے بھی ایک نسوانی لطافت تھی۔

بچوں سے نفرت کا احساس شاید لیلا میں موروثی تھا۔ لیلا کی ماں کو بھی بچے چنداں بھلے معلوم نہ دیتے۔ گو اسے لیلا سے بے حد محبت تھی لیکن اس کے نزدیک دوسرے بچے لعنت سے کم نہ تھے۔ وہ ہمیشہ دوسرے بچوں کو بحیثیت بچے کے نہ دیکھا کرتی بلکہ ایک ہمالیہ کی سی بلندی پر بیٹھ کر ان کا جائزہ لیتی اور انہیں ہر کام میں ناقص پاتی اسے بچوں کی رنگین شرارتیں ہرگز پسند نہ تھیں۔ اسی لیے وہ بچوں کی بے ضرر معمولی حرکتوں کو بھی معاف نہ کر سکتی، یہی عادتیں اور خیالات لیلا کے خون میں بھی گردش کر رہے تھے۔

جب لیلا کی شادی ہوئی اور اس کے شوہر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دن پوچھا: "لیلا کیا تم بچے پسند کروگی؟" تو اسکی آنکھوں میں ایک شدید نفرت کا جذبہ لہرا گیا اور اس نے نہایت مستقل مزاجی سے جواب دیا۔

"نہیں، ہمیں ابھی بچے نہیں چاہئیں"۔

کپڑے

لیلا کے نزدیک شادی اچھے اچھے کپڑے پہننے اور پارٹیوں میں جانے تک محدود تھی۔

اچانک فرش پر سویا ہوا بچہ چلّا اُٹھا۔ مالن نے ساڑھی ایک طرف رکھ کر اسے گود میں اُٹھا لیا اور اسے ہلا ہلا کر پچکارنے لگی۔ لیلا کی نظریں میگزین سے فوراً ہٹ گئیں اور وہ روتے ہوئے بچے کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

"ہاں میرے لال، ہاں۔ کیا ہوا بچے۔ ہاں۔ ہاں" مالن بچے کو بہلانے لگی

ایکا ایک بچے نے پیشاب کر دیا۔

"پیشاب کر دیا!" لیلا تڑپ کر صوفے سے اُٹھ بیٹھی "مالن تو کچھ نہیں دیکھتی وہ دیکھو میری نئی ساڑھی بھیگی جا رہی ہے۔ ستیاناس کر دیا۔ اب کیا پہنوں گی مسز گپتا کی پارٹی میں۔ تمہارا سر؟ کمبخت"! لیلا نے لپک کر ساڑھی اُٹھا لی ساڑھی کا پلو کچھ بھیگ گیا تھا۔

"بی بی جی ۔۔۔۔" مالن نے ملتجیانہ نظروں سے لیلا کی طرف دیکھا۔

"چل نکل۔ جا پہلے چپ کرا اس بچے کو!" مالن کھسیانی ہو کر باہر چل دی۔

"بوائے۔ اے بیرا۔ ذرا مہتر کو کہو یہ جگہ صاف کر دے" اچانک اسکی آواز ایک شور میں ڈوب گئی۔ باہر کوٹھے کے عقب میں چند بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔

"اری جا جا یہ آم تو میرا ہے۔ میں نے پتھّر سے گرایا تھا" ایک کہہ رہا تھا۔

"واہ یہ تو میرے پتھر سے گرا تھا" مالن کی چھوٹی لڑکی نے اپنی مہین سی آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں شمو نے گرایا تھا۔ شمو نے گرایا تھا شمو نے گرایا تھا" کا شور بلند ہوا۔

"ارے سب جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ افضل کے پتھر سے گرا ہے" ایک اور آواز آئی۔

"اُف یہ کمبخت اس کڑکتی دوپہر میں بھی تو چین نہیں لینے دیں گے۔ مرتے نہیں ہیں یہ کہیں جا کے" تیلا تڑپ کر بولی "جمعدار، او جمعدار! یہ کیسا شور ہے۔ بھگاؤ ان آفت کے پرکالوں کو یہاں سے" مالکن کی آواز سنتے ہی سب بچے نو دو گیارہ ہو گئے۔ سب سے آگے ایک لڑکا تھا جس کے ہاتھ میں تین چار آم تھے اور اس کے پیچھے سارا کا سارا گروہ غل مچاتا بھاگ رہا تھا۔ سب کے کپڑے پھٹے پرانے اور سخت میلے تھے۔ کرتوں کے گلے کھلے ہوئے تھے۔ بال یوں بکھرے ہوئے تھے گویا برسوں سے تیل نہ لگایا ہو۔ اور ان کے قہقہوں کا شور دوپہر کی خاموشی کو تار تار کر رہا تھا۔

"کمبخت کیڑے ہیں کیڑے!" تیلا نے ایک حقارت بھری نظر بھاگتے ہوئے بچوں پر ڈالی اور پھر چق اٹھا کر کمرے میں چلی گئی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اور پھر تیلا کو یوں معلوم ہوا جیسے اس کے اندر ایک زبردست انقلاب آ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مستقبل کا آسیب ناچنے لگا وہ اس نئی آفت ہے

کیڑے
گھبرا گئی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگے۔
کیا یہ اسکی آواز میں خلل ڈالیگی؟ کیا یہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگی؟
"یہ تم نے کیا کر دیا؟" لیلا نے اچانک اپنے شوہر سے کہا۔
"کیا کر دیا؟" لیلا کے شوہر نے اخبار بند کرتے ہوئے پوچھا۔
"مجھے تو ابھی بچے نہیں چاہیئے تھے۔ کس جھنجھٹ میں ڈال دیا تم نے؟ ابھی شادی ہوئے چار سال بھی تو نہیں ہوئے ہیں!"
"تو کیا لوگوں کے شادی کے بیس بیس سال بعد بچے ہوتے ہیں؟"
"لیکن مجھے تو یہ آفت معلوم ہوتی ہے!"
"بچے تو گھر کی رونق ہوتے ہیں لیلا"
"ہاں مردوں کے لیے ہوتے ہوں گے۔ یہاں تو سب کچھ حرام ہو جائے گا۔ سارا دن بچے کو گھٹنوں پر سے گرد ہائی مچائی ہو گی۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"
"ہوا کیا، اگر نہیں ہو سکے گا تو ایک آیا رکھ لیں گے۔" لیلا کے شوہر نے نہایت نرمی سے کہا۔
"ہوں مصیبت!" لیلا یہ کہہ کر منھ بسورے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کتنی آفت رہے گی؟ وہ دل ہی دل میں آنے والی مصیبت کا اندازہ لگانے لگی۔ یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے مالن کے بچوں کے سیاہ چہرے پھیل گئے ——— کیڑوں کی طرح ادھر ادھر کلبلاتے۔ اور اسے متلی سی محسوس ہونے لگی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جوں جوں دن قریب آتے گئے لیلا کا خوف بڑھتا گیا۔ بچہ اس کے پیٹ میں حرکت کرنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگتا جیسے اب وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہو۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی۔ اس کے خیالات اس کے ذہن پر سیاہ ڈراؤنے بادلوں کی طرح چھا جاتے۔ اس کا عضو عضو کانپنے لگتا۔ اس کے خیالی اندھیرے میں کہیں دو ہاتھ نکل کر اس کی گردن کو پکڑ کر زور سے دبانے لگتے۔ کمرے کی فضا اسے گھٹی معلوم دیتی۔ اس کا سانس رک جاتا، آنکھیں پھٹ کر باہر آ جاتیں اور اُسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے دم بھر میں اس کی ہستی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ کمرے کی ہر چیز اسے ڈولتی دکھائی دیتی۔ نبض تیز تیز چلنے لگتی اور خون کی تیز گردش کی وجہ سے اسے یوں معلوم ہوتا جیسے اس کا جسم گرم گرم شعاعیں بکھیر رہا ہو۔

لیلا کی زندگی کی تمام دلچسپیاں ختم ہوتی معلوم دیتیں۔ جب کبھی وہ آئینہ کے سامنے جا کر کھڑی ہوتی تو اُسے ایک کوفت کا احساس ہوتا۔ اس کے جسم کے خوبصورت خد و خال بالکل بگڑ گئے تھے۔ لیلا کو ہمیشہ سے اپنے جسم کی خوبصورت قوسوں پر ناز تھا لیکن اب جب وہ یہ دیکھتی کہ اس کی کمر کے قریب سے اس کا پیٹ بڑی تیزی سے پھول رہا ہے تو اس کا تمام ناز تمام فخر مٹی میں مل جاتا اور وہ اپنے آپ اور ہونے والے "بچے" کو کوسنے لگتی۔

"کتنی آفت ہے یہ؟" اور یہ آفت اس کی آنکھوں کے سامنے پھیل کر ایک آسیبی شکل اختیار کر لیتی۔ اسے اپنے کپڑے بالکل تنگ معلوم ہوتے اور ان میں اس کا بھدّا، بے ڈول جسم باہر جھانکتا دکھلائی دیتا۔ اب اسے نئے نئے

کپڑے
کپڑے پہننے میں چنداں خوشی حاصل نہ ہوتی۔ اس نے پارٹیوں میں جانا بالکل چھوڑ دیا۔ باہر جاتے وقت اسے بے حد شرم محسوس ہوتی گویا اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ وہ سارا دن گھر میں کمرے کے اندر بیٹھی رہتی۔ حتیٰ کہ وہ نوکروں کے سامنے نکلنے سے بھی ہچکچاتی۔ اسے ہر وقت اپنی زندگی ایک گراں بوجھ کے نیچے دبی معلوم ہوتی۔

"تم نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے" وہ اپنے شوہر سے کبھی کبھی جھگڑ پڑتی "اس زندگی سے تو میرا مر جانا بہتر ہے!"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

"اُف بی بی جی نے تو کتنی ہائے توبہ مچائی۔ پہلا بچہ ہے نا شاید" دائی نے نوزائیدہ بچے کو لیلا کے پاس پالنے میں لٹاتے ہوئے کہا۔

پہلا بچہ ہے! اور کیا یہاں درجنوں ہوں گے؟ لیلا دائی کی بات سن کر جل بھن گئی لیکن اپنی ماں کو سامنے دیکھ کر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"ہاں اسی لیے تو" لیلا کی ماں نے کہا "جب لیلا ہوئی تھی تو مجھے بھی سخت درد ہوا تھا۔ میں تو بالکل گھبرا گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے میرا کیس بہت خطرناک بتلایا تھا لیکن ایشور کی مرضی تھی کہ میں بچ گئی" لیلا کی ماں اپنا تجربہ مفصّل طور پر سنانے لگی۔

"نہیں جی۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ محض ڈر کی وجہ سے درد زیادہ ہوتا ہے میرے خدا کے فضل سے گیارہ بچے ہوئے" دائی نے کہا۔

گیارہ بچے! لیلا کے دماغ پر ایک چوٹ لگی۔ ہندوستانی عورت بچہ جننے کی

مشین ہے کیا؟ اسے اپنی صنعت پر غصہ آنے لگا۔ کپڑے

"تیلا ننھے کو دیکھوگی؟" تیلا کی ماں نے پوچھا، تیلا نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ سے پیٹھ پھیر لی۔

"ماں جی، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں کو بچے سے پیار نہیں ہوتا، لیکن دو چار دن بعد ماں کی ممتا جوش مارتی ہے!" اور وہ یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

تیلا کو لیٹے لیٹے اُس کی ہنسی مذاق اُڑاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اسے دائی کی ہر بات زہر بجھے تیر کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دائی کو کمرے سے باہر نکال دے لیکن پھر کچھ کمزوری کے باعث اور کچھ اپنی ماں کے ڈر سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔

پالنے میں پڑا ہوا بچہ اس کی خودی کو ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی گویا بچہ کی پیدائش نے اسے پستی کے غار میں ڈھکیل دیا ہو۔ اس نے ایک نظر بچے کی طرف ڈالی۔ لال لال گوشت کا لوتھڑا معصوم نیند سو رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اچانک اس کی نارنگی کی پھانکوں جیسے لال لال ہونٹ کھلے اور بچہ چلّا اُٹھا۔ بچہ کی چیخیں تیلا کا منھ چڑاتی معلوم ہوئیں۔ اس نے منھ پھیر لیا۔

دائی نے لپک کر بچے کو اُٹھا لیا اور اسے چُپ کرانے لگی۔

"اوں، اوں۔ میرا لال کبھی نہ روئے۔ تو تو راجہ بیٹا ہے۔ چپ ہو جا" بچہ ان بے ہنگم، بے معنی آوازوں کو سن کر بھی چُپ ہو گیا۔ تیلا کو یہ آوازیں سُن کر کوفت سی ہونے لگی۔ کیا اسے بھی یہ سب کچھ کرنا ہوگا؟ دائی نے بچے کو پالنے میں

کپڑے
ڈال دیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

"تمہارے لیے گرم گرم دودھ لے آؤں؟ اس حالت میں بہت فائدہ مند ہوگا"

لیلا کی ماں یہ کہہ کر چلی گئی۔

لیلا کی آنکھیں چھت اور دیواروں کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے ذہن میں غصّہ کا ایک طوفان موجیں مار رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نظر پالنے پر پڑی۔ بچہ خاموش سو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوتے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا اور اس کے ساتھ ہی عجیب سا منھ بنا لیتا۔ لیلا بچے کو دیکھتے دیکھتے سب کچھ بھول گئی اور بے اختیار مسکرا دی اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں سے کوئی چیز اوپر اُبھری ایک لطیف سی خلش جس نے اس کے سارے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی اور جس نے اسے بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بچے کو بغور دیکھنے لگی۔ کتنا خوبصورت تھا وہ! بچے کے سر کے سنہری بال ریشم کی طرح ملائم تھے۔ اس کی خمدار باریک پلکیں جو کسی پہاڑ کے موڑ پر درختوں کی قطار کی مانند تھیں۔ اس کے شہد سے بھرے ہوئے ہونٹ، اس کی ابھری ہوئی ناک اور اس کے تیکھے نقش بالکل اس کے اپنے چہرے سے ملتے جلتے تھے جسے کئی بار آئینہ میں اس نے نہایت غرور سے دیکھا تھا۔

لیلا نے یکایک محسوس کیا جیسے اس کا وجود ایک نامعلوم مسرت سے جھوم اُٹھا ہو اور وہ زندگی کی بلندیوں تک ایک ہی جست میں جا پہونچی ہو۔ وہ اپنی اس نئی تخلیق کو ناز بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

باہر سے مالن کے بچوں کے غل مچانے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی

ساتھ زمین پر جیسے کوئی برتن گر پڑا ہو۔

"کمبخت پل بھر چین نہیں لینے دیتے!" لیلا کو اپنی ماں کی غصہ بھری آواز باہر سے سُنائی دی "ستیا ناس ہو اِن کا۔ سارا دودھ گرا دیا۔ کیڑے ہیں کیڑے!" لیلا کی ماں مالن کے بچوں پر برس رہی تھی۔

لیلا مسکرائی۔ اس نے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

(نامی پریس لکھنؤ)